بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

جنرل الیکشن اکتوبر 2002ء

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں، بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں، لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور ارباب حکومت عوام کے خادم ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ عوام کی خدمت نہیں، بلکہ سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ عہد قدیم کے کسی دانشور کے نہیں، جو اس نتیجے پر اس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیب حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اسے ان نظامہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اس کے سامنے بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجے پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک بہت بڑے سیاسی مفکر (H.J. Mencken) کے ہیں جسے انہوں نے عہد قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ انسان ان تمام صدیوں کی استخواں شکن تگ و تاز، مہیب خوں ریزیوں اور وحشت خیز آتش فشانیوں کے بعد اپنے مختلف تجارب کو ناکام قرار دیتا ہوا جس آخری نظام تک پہنچا ہے وہ مغرب کا جمہوری نظام ہے۔ اس پر یورپ کو بڑا ناز تھا اور اب بھی بیشتر ممالک میں اسے بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کی اس آخری کامیابی کے متعلق بھی پروفیسر مینکن لکھتا ہے کہ:

> ان مختلف اسالیب حکومت میں سب سے زیادہ ناکام نظام جمہوریت رہا ہے جمہوری نظام کے ارباب حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہئے لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو قوت بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے یہ لوگ ان عناصر کے بل بوتے پر جو فی الحقیقت عوام کے دشمن ہوتے ہیں لامتناہی عرصے تک برسر اقتدار رہتے ہیں۔

ہم مغرب کے نظام جمہوریت کے خلاف خود وہاں کے ارباب فکر وسیاست کی آراء وافکار اس کثرت سے پیش کر چکے ہیں کہ ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ان ارباب فکر ونظر کے نزدیک اس نظام (یا انسانوں کے وضع کردہ ہر نظام) کی ناکامی کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) کا نامور مصنف بریفو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار واختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ طاقت ور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت عدل وانصاف کو پامال کر دیتی ہے' اس لئے ظالم وجابر ہوتی ہے۔ یہ انکشاف آج کا نہیں' بہت پرانا ہے کہ انسانی اقتدار بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوت انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مطلق قوت اسے بالکلیہ تباہ کر دیتی ہے۔ نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ ومنصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی' دولت وحشمت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی' کسی افسر کی ہو یا حاکم کی' کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہر حال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے اور ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت' محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر' اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

دور حاضر کے جمہوری نظام میں بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر یہ اقتدار قانون سازی کے اختیار کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ قوانین جنہیں محض اس لئے صحیح اور جائز قرار دیا جاتا ہے کہ انہیں اکثریت نے وضع کیا ہے۔ ان قوانین کو قوت کے زور پر منوایا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ صحیح انسانیت ساز نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں انسانوں کو قانون سازی کے مطلق اختیارات حاصل نہ ہوں۔ لیکن انسانی فکر اس قسم کا کوئی نظام نہ وضع کر سکی ہے نہ کر سکتی ہے' نہ کر سکے گی۔ اس قسم کا نظام صرف وحی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ وہ وحی جس نے بتایا کہ قوانین سازی کے اصول اور حدود خدا کی طرف سے متعین شدہ ہیں جن میں کوئی انسان' کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ ہر زمانے کے انسان باہمی مشاورت سے یہ طے کریں گے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' ہم اپنا نظام تمدن کس قسم کا متعین اور متشکل کریں۔ یہ حدود واصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو تمدنی احکام وقوانین وضع کئے جائیں گے ان میں حالات کے تقاضے کے مطابق ردوبدل ہوتا رہے گا۔ یہ اصول وحدود قرآن کریم کے اندر درج اور محفوظ ہیں۔ ہر دور کے انسان باہمی مشاورت سے' ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین خود وضع کریں گے۔ مشاورت کی مشینری کس قسم کی ہوگی۔ اسے بھی اس نے خود متعین نہیں کیا۔ اسے انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ طریق تھا جس کے مطابق اسلام کے صدر اول میں ایسا نظام تمدن قائم ہوا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار نہیں رکھتا تھا۔ جس میں نہ کوئی حاکم تھا نہ محکوم۔ وہ سب' اصول واقدار خداوندی کے تابع اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کامل آزادی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چشم فلک نے اس جیسا دور پھر کبھی نہیں دیکھا۔ مملکت پاکستان کا مطالبہ اور حصول پھر سے اسی قسم

کا نظام قائم کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم نے یہ مقصد اور منتہیٰ فراموش کر دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب اس مقصد اور منتہیٰ کو فراموش کر دیا تو لامحالہ ہمیں بھی انسانوں کا وضع کردہ نظام تمدن ہی اختیار کرنا تھا۔ یہ نظام تمدن وہ ہے جسے مغرب کا جمہوری نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے برسرحق ہونے کی ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ یہ نظام اب دنیا میں عام طور پر رائج ہے اور اقوام مغرب کا پسندیدہ۔ وائے برحال ما کہ ہمارے ہاں کے اقامت دین کے مدعی بھی اس نظام کی مدح وستائش میں رطب اللسان ہیں۔ وہ اسے عین مطابق اسلام قرار دیتے ہیں۔

اس جمہوری نظام کی مشینری کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ایک متعین وقفہ کے بعد ملک میں عام انتخابات کئے جائیں۔ یہ طرز انتخاب بجائے خویش مغربی نظام جمہوریت کی ناکامی کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس طرز کے نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ انتخابات کے سلسلے میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ انتخابات منصفانہ ہونے چاہئیں' ان میں دھاندلی نہیں ہونی چاہئے' اس سے زیادہ مطالبہ کوئی نہیں کیا جاتا۔ اس بنیادی کمزوری کو آپ ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کے حلقۂ انتخاب کا ایک چھٹا ہوا بدمعاش بطور امیدوار کھڑا ہو جاتا ہے۔ انتخابات بالکل منصفانہ ہوتے ہیں لیکن وہ اس کا انتظام کر لیتا ہے کہ اکاون فیصد ووٹ اس کے حق میں ڈالے جائیں۔ چنانچہ وہ قاعدے اور قانون کے عین مطابق بغیر کسی دھاندلی کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا آپ اسے اپنا نمائندہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے؟ لیکن سوال آپ کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا نہیں' قانون کی رو سے آپ کو اسے اپنے حلقہ کا نمائندہ تسلیم کرنا ہوگا۔ اب آگے بڑھئے۔ فرض کیجئے کہ اسمبلی میں ایسے لوگ اکثریت حاصل کر لیتے ہیں جنہیں آپ بطیّب خاطر اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن وہ اپنی اپنی مدت رکنیت کے دوران جس قدر فیصلے کریں گے' انہیں آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ خواہ وہ فیصلے کسی قسم کے ہوں۔ ملک کی بڑی سے بڑی عدالت بھی صرف یہ دیکھے گی کہ ان کے یہ فیصلے (یعنی ان کے وضع کردہ قوانین) آئینِ مملکت کی شرائط پوری کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ان شرائط پر پورے اترتے ہوں تو عدالت عالیہ تک کو بھی انہیں مسترد کر دینا تو ایک طرف ان میں کسی قسم کے ردوبدل کا بھی حق حاصل نہیں ہوگا۔ یعنی ان لوگوں کے فیصلوں کے خلاف آپ کی کوئی اپیل بھی قابل قبول قرار نہیں پائے گی۔ یہ ہے موجودہ نظام جمہوریت۔ ہم نے اپنے ہاں آئینی طور پر اس نظام کو قبول اور نافذ کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ کہیں گے کہ اسے بدلنے کا تو ہمیں حق حاصل نہیں۔ لہٰذا ان حالات میں ہم اس کے مطابق عمل درآمد پر مجبور ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو ایک اختیار تو بہرحال حاصل ہے جسے کوئی آئین اور کوئی قانون آپ سے چھین نہیں سکتا۔ یعنی یہ اختیار کہ آپ اس شخص کو ووٹ دیں جس کی صداقت' شرافت' امانت' دیانت اور اہلیت پر آپ کو پورا پورا بھروسہ ہو۔ ایسے شخص کے تولنے اور ماپنے کے لئے قرآن کریم نے ایک ایسا پیمانہ عطا کر دیا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے مخالفین نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو آپ نے (قرآن کی شہادت کے مطابق) فرمایا کہ:

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہٖ افلا تعقلون (۱۰/۱۶)

میں کوئی اجنبی یا نو وارد نہیں، میں نے تم میں اس سے پہلے اپنی پوری عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس پر غور کر کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔

اس میں **من قبلہٖ** کا ٹکڑا بڑا بنیادی ہے۔ جب کوئی شخص کسی منصب کے لئے آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنی وضع کو بڑا مقدس بنالیتا ہے لیکن اس کا صحیح کیریکٹر اس کی اس زمانے کی زندگی سے سامنے آسکتا ہے جب وہ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ بس یہ ہے صحیح پیمانہ۔ جو شخص بطور امیدوار کھڑا ہو آپ یہ دیکھئے کہ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی گذری ہے۔ اس سے آپ اس کے کیریکٹر کا اندازہ لگا لیجئے اور اگر وہ صحیح معیار پر پورا اترے تو پھر اس کے حق میں ووٹ دیجئے۔

یہاں تک تو اس امیدوار کے صرف انسان ہونے تک کی بات تھی۔ اگر آپ اسے اسلام کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہئے کہ وہ اس کا اعلان کرے اگر مجلس قانون ساز میں کوئی معاملہ ایسا پیش آ گیا جو قرآن مجید کے خلاف ہو تو میں اس کی اعلانیہ مخالفت کروں گا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو جن لوگوں نے مجھے ووٹ دیا ہوگا انہیں اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ مجھ سے رکنیت سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کریں۔ اس اعلان سے وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ کہلا سکے گا۔ آپ اس قسم کے نمائندوں کو اکثریت کے ساتھ اسمبلیوں میں بھیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان اسمبلیوں کی ایک ہی مدتِ حیات میں معاشرہ میں کس قدر خوشگوار انقلاب آجاتا ہے۔

جہاں تک تحریک طلوع اسلام کا تعلق ہے، ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ نہ ہماری اپنی کوئی سیاسی پارٹی ہے، نہ ہم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر بزم طلوع اسلام کا کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہے تو اسے بزم کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ بزم کا رکن البتہ اپنی ذاتی حیثیت سے آزاد امیدوار کے طور پر اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس اسمبلی میں کوئی مسئلہ ایسا سامنے آئے گا جو قرآن مجید کے خلاف ہوگا تو وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ انتخابات ۱۰ اکتوبر کو ہوں گے۔ اس دوران میں ظاہر ہے کہ ملک انتخابی سرگرمیوں کے بحران میں مبتلا ہوگا۔ لیکن طلوع اسلام کی بزموں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کسی ہنگامہ میں حصہ نہ لیں۔ اپنی صوابدید کے مطابق بہترین امیدوار کے حق میں ووٹ دیں، اور نہایت ہی خاموشی اور سکون سے، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے پروگرام پر عمل پیرا رہیں۔ یہ سب ہنگامے رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے اور آخر الامر سربلندی قرآن ہی کے پیغام کو نصیب ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثریا کوثر قیصرانی

دوسری قسط

گوہر ہائے آب دار

(علامہ پرویزؒ کے خطوط سے اقتباسات)

محترمہ بلند اختر (بیگم رضا علی) قرآن کریم کی طالبہ ہیں۔ان کا شمار علامہ پرویز کے اولین شاگردوں میں سے ہوتا ہے۔کراچی میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے ان کا علامہ پرویز سے رابطہ بذریعہ خط وکتابت زیادہ رہا۔انہیں ذاتی مسائل پر بھی علامہ پرویز سے مشورہ کرنا ہوتا تو خط لکھ دیا کرتیں۔آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ نجی نوعیت کے ان خطوط میں بھی مفکر قرآن نے علم وحکمت کے موتی پرو دیے ہیں۔ان کی اہمیت کے مدنظر محترمہ بلند اختر کے نام علامہ پرویز کے خطوط سے اقتباسات کی دوسری قسط افادہ عام کے لئے پیش خدمت ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ قوم ہنگامی حالات اور انتشار انگیز تحریکات سے تنگ آ کر کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قوم جب بھی سوچنے کی طرف آئے گی تو طلوع اسلام کی قرآنی فکر کے سوا اسے کہیں سکون نہیں مل سکے گا۔اس کا نتیجہ ہے کہ (بفضلہٖ) طلوع اسلام کی تحریک بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔لیکن جتنی تیزی سے یہ آگے بڑھ رہی ہے اتنا ہی زیادہ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہماری مالی حالات قوم کے اس تقاضا کا ساتھ نہیں دے سکتے۔اگر اس وقت یہ دقت میرے راستے میں حائل نہ ہوتی تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت جلد نہایت خوشگوار نتائج ہمارے سامنے آ سکتے تھے۔بہرحال ہم فکر احباب میں سے جو بھی اس کے لئے کچھ کرتا ہے میرے لئے باعث تشکر ہوتا ہے۔''(۳۱/۲/۷۲)

☆☆☆

''یہ امر میرے لئے باعث صد مسرت ہے کہ آپ اپنے معاملات کو خود حل کرنے کے قابل ہوتی جا رہی ہیں۔قرآن کریم کی تعلیم سے جب انسان کے اندر ایک تبدیلی آتی ہے تو اس کی معاملات کے حل کرنے کی صلاحیتیں بھی بیدار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔اور جب اس کے ساتھ دل کا سکون اور انسانی ذات کا توازن شامل ہو جائے تو پھر کوئی مسئلہ لاینحل رہ نہیں جاتا۔اللہ تعالیٰ آپ کی ان صلاحیتوں میں مزید استحکام عطا فرمائے۔''(۳۱/۲/۷۲)

☆☆☆

''میں سینما از خود نہیں دیکھا کرتا۔کوئی اچھی فلم آتی ہے تو ہم ذوق احباب اس کا تذکرہ کر دیتے ہیں اور آ کر ساتھ لے جاتے ہیں۔معلوم ہوا کہ یہ فلم (25th Hour) لاہور سے ہو کر چلی گئی ہے۔اسے دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔جب دوبارہ آئے گی تو ضرور وقت نکالوں گا۔اب یورپ اور امریکہ کی اکثر فلمیں اس انداز کی ہیں۔انسان اپنے گہرے زخموں کو کب تک چھپا سکتا ہے۔''
(۳۱/۵/۷۲)

☆☆☆

''یہ ٹھیک ہے کہ ہماری تحریک اب حیرت انگیز طور پر روبہ ترقی ہے اور اسی لئے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت کی شدت بھی لازمی ہے۔لیکن یہ مخالفت تو ہمارے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ہمارے اپنے پاس تو پبلسٹی کے ذرائع ہیں نہیں، ان کی مخالفت سے ہماری آواز دور دور تک پھیل جاتی ہے۔اسی لئے میں تو اس مخالفت سے بہت خوش ہوا کرتا ہوں۔ہمیں اتنی احتیاط

رکھنی چاہئے کہ ہم مخالفین سے الجھ نہ پڑیں۔اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ خاردار جھاڑیوں سے دامن بچاتے ہوئے نکل جانا تقویٰ کہلاتا ہے۔'' (۲۵/۶/۷۲)۔

☆☆☆

''قرآنی فکر کی نشرواشاعت کے لئے آپ کے دل میں کس قدر شدید جذبہ ہے مجھے اس کا احساس ہے۔لیکن جذبات کی شدت میں ہمیں حقائق کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی کے پاس لاکھ دو لاکھ روپیہ ہو اور اس میں سے دس بیس ہزار روپیہ دیدیا جائے تو یہ مناسب رہتا ہے لیکن جس کے پاس ہو ہی بیس پچیس ہزار روپیہ' تو اسے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی میں کئی نشیب وفراز آتے ہیں' ایسے وقت کے لئے اپنے پاس تھوڑا بہت اثاثہ تو ضرور ہونا چاہئے۔ میرے اپنے پاس تو نہ کبھی ہوا ہے اور نہ میں نے رکھا ہی ہے لیکن جنہوں نے کسی نہ کسی طرح پس انداز کرلیا ہو تو ان سے میں یہی تاکید کیا کرتا ہوں کہ وہ اسے سنبھال کر رکھیں۔ نمعلوم اس کی کب ضرورت پڑ جائے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے وقت میں کوئی کسی کے کام نہیں آیا کرتا۔'' (۲۵/۶/۷۲)

☆☆☆

''میرے درس یا تقریریں جو ٹیپ میں محفوظ ہو جاتی ہیں' ان سے مجھے بھی اس احساس کے ماتحت بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ جس کا جب جی چاہے' ان سے استفادہ کرسکتا ہے ورنہ ان کے بغیر میری قرآنی فکر کا دائرہ بڑا ہی محدود رہ جاتا۔ دیکھئے' انسان کے علمی اور سائنسی اکتشافات اگر صحیح طریق پر استعمال کئے جائیں تو ان سے انسانی نفع بخشیاں کتنی وسیع ہو جاتی ہیں۔'' (۲۰/۱/۷۳)

☆☆☆

''آپ نے تجویز کیا ہے کہ ایک چھوٹی سی کتاب ہونی چاہئے' جس میں روزمرہ زندگی سے متعلق قرآنی احکام درج ہوں۔ یہ کتاب پہلے سے موجود ہے یعنی ''اسلامی معاشرت'' اور اس نے بڑی مقبولیت حاصل کر رکھی ہے۔'' (۲۰/۱/۷۳)

☆☆☆

''حقیقت یہ ہے کہ جب سے میں نے قرآن کریم کو اپنا حقیقی راہنما بنایا ہے' میں تاریخ کے جھنجھٹ میں نہیں الجھتا۔اس لئے کہ تاریخ ہی تھی جس نے مجھے کسی زمانہ میں خود اسلام ہی سے برگشتہ کر دیا تھا اور اگر مجھے قرآن کی راہنمائی میسر نہ آتی تو معلوم نہیں کہ میں کہاں سے کہاں نکل گیا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان سوالات سے اجتناب برتتا ہوں' جن کا تعلق تاریخ سے ہے۔اسے صحیح طور پر وہی سمجھ سکتا ہے جو قرآن کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرے لیکن چونکہ اس سے ان خیالات پر زد پڑتی ہے' جنہیں ہم پہلے سے اپنے دل میں رکھے ہوتے ہیں' اس لئے ہر شخص اس سے جی چراتا ہے۔

میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ واقعہ کربلا ہوا ہی نہیں تھا' البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ اس میں غلط روایات نے اتنا کچھ ملا دیا ہے کہ اصل حقیقت کا معلوم کرنا' ناممکن ہو گیا ہے۔

سنیوں کی سب سے معتبر حدیث کی کتاب ''بخاری شریف'' میں لکھا ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا' وہ بخشا جا چکا ہے اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ پہلا لشکر وہ تھا' جس کا سپہ سالار ''یزید'' تھا اور امام حسینؓ اس میں بطور سپاہی کے شامل تھے۔ سوچئے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مانا جائے تو پھر واقعہ کربلا کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ دوسری طرف حدیث ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ''بخاری'' کی کسی ایک حدیث

کا انکار بھی کفر ہے۔

پھر تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ معاذ اللہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ کے گھر کے دروازے کو توڑا اور انہیں بالوں سے گھسیٹا اور ان کا (توبہ توبہ) حمل ساقط ہو گیا' اور حضرت علیؓ یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ میری تو اس کے تصور سے روح کپکپا اٹھتی ہے اور دوسری طرف تاریخ ہی یہ بتاتی ہے کہ خود حضرت علیؓ کی صاحبزادی ام کلثومؓ ' حضرت عمرؓ کے نکاح میں تھی۔ فرمائیے کہ ان باتوں کو کیسے مان لیا جائے۔

جہاں تک اہل بیت تعلق ہے' عربی زبان کے قاعدے اور قرآن کریم کی تصریح کے مطابق رسولؐ اللہ کی ازواج مطہرات سب سے پہلے اہل بیت میں شامل ہوتی ہیں۔ قرآن انہیں مومنین کی مائیں قرار دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف انہی ازواج رسولؐ اللہ میں سے بعض کے متعلق شیعہ حضرات جو کچھ کہتے ہیں' اس کا کس کو علم نہیں۔۔؟ کہئے کس کی مانیں اور کسے جھٹلائیں۔

میرا مسلک یہ ہے کہ صدر اولؐ کے جتنے مسلمان تھے' جنہیں صحابہ کبارؓ کہا جاتا ہے اور جس میں رسولؐ اللہ کے اہل بیت سب سے پہلے آ جاتے ہیں' وہ سب قرآن کی تصریحات کے مطابق' پکے اور سچے مومن تھے۔ ان سب کا احترام میرے دل میں ہے۔ میں ان میں سے کسی کو برا نہیں کہتا۔

تاریخ کس طرح بنتی ہے' اس کی شہادت خود وہ واقعہ بہم پہنچا دیتا ہے جو رضا صاحب نے بیان فرمایا ہے۔ رشید ترابی صاحب نے ایک مجمع کے سامنے جو یقیناً سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہو گا' علی الاعلان کہا کہ پرویز صاحب نے اقبال کے شعر پڑھتے ہوئے' اس حصے کو چھوڑ دیا' جس میں اہل بیت کا ذکر تھا۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ ان سینکڑوں ہزاروں سامعین میں سے کسی نے ان سے پوچھا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے؟ نہ انہوں نے ایسا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ سننے والوں نے ان سے دریافت کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

اب یہ ہزاروں افراد اس بات کو ہزاروں تک آگے پہنچائیں گے' اور سند ہو جائے گی علامہ رشید ترابی صاحب' جو اتنی بڑی قابل اعتماد پوزیشن رکھتے ہیں۔ اور پھر آنے والا مورخ اس صریح جھوٹ کو ایک حقیقت کے طور پر اپنی تاریخ میں لکھ دے گا۔ یہ ہے وہ طریق حس سے تاریخ بنتی ہے۔ جس پرویز پر ترابی صاحب نے اس دھڑلے سے ایسا الزام لگا دیا وہ آج بھی زندہ موجود ہے۔ کیا ترابی صاحب نے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ پرویز سے پوچھ لیتے کہ کیا تم نے ایسا کہا ہے؟

سو یہ ہے میری بہن' اس تاریخ کی حقیقت' جسے ہم اپنے اعتقادات کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ پرویز' اعتقادات کے معاملے میں خدا کی کتاب کو سند اور حجت تسلیم کرتا ہے اور اس نے جو مقام کسی کو دیا ہے' اس مقام کے سامنے اپنی چشم احترام جھکا دیتا ہے۔''

(۲۳/۲/۷۳)

☆☆☆

''جیسا کہ میں نے پہلے بھی مشورۃً کہا تھا' آپ ایسا انتظام ضرور کر لیں کہ آپ کو تا زیست کسی کا مالی محتاج نہ ہونا پڑے۔ موجودہ معاشرے میں اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ (خدانکردہ) کسی حادثہ کی وجہ سے ایسے انتظام کا بگڑ جانا اور بات ہے لیکن اپنی طرف سے انسان کو اس کا اطمینان ضرور کر لینا چاہئے۔ رفاہی کاموں میں امداد کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا ہے۔''

(۲۶/۹/۷۳)۔

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ پرویز علیہ الرحمتہ

جنگ اور انسان

جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

انسان بھی ایک طُرفہ تماشا ہے

اسے عبادت گاہوں میں محوِ نیاز دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پر نثار اور جنت کی حوریں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں۔ اس کا ایک ایک سجدہ، زمین اور آسمان کو وجد میں لاتا، اور فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ اور اگر اسے محبت کے حریم ناز میں سربزانو دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ شب کی تاریکیوں میں شمعِ کافوری کا کام دیں۔ آفتاب، اس کے دل کی تپش و خلش سے حرارت مستعار لیتا ہے کہ وہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کر دے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے سوز و گداز سے، اپنے اندر نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

اور اگر اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو اس کا فکرِ فلک پیما، زمین کی پستیوں سے آسمان کے راز فاش کرتا اور مہر و مہ و ستارہ پر کمندیں ڈالتا ہے۔ وہ زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی اختراعاتِ جمیلہ، تہذیب و تمدن کے قصرِ رنگیں میں، نور و نگہت کی ندیاں رواں کر دیتی ہیں۔

لیکن۔۔ یہی انسان جب نشۂ قوت سے بدمست، اور ہوسِ خون آشامی سے مدہوش ہو کر، اپنے ہی جیسے انسانوں کے خلاف بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح امنڈتا ہے تو عبودیت کا عجز و نیاز۔ محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا ساز و یراق، سب اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ یہ خود اپنے ہاتھوں کے تعمیر کردہ قصرِ تہذیب و تمدن کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور انسان کا خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو جاتا ہے۔

خوں ریزی کی وسعتیں

اس کی ساری تاریخ، اسی خوں ریزی اور آتش بازی کی ہولناک داستان ہے۔ یہ جوں جوں علم و عقل میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کی تباہ کاریوں کی وسعت حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب دارا نے یونان کی طرف لشکر کشائی کی تو اس کے ساتھ صرف دس ہزار فوج تھی۔ جب اسکندر نے ایشیاء کی طرف رخ کیا تو اس کے جلو میں تیس ہزار کا لشکر تھا۔ جب نپولین نے روس

پر حملہ کیا تو پانچ لاکھ فوج اس کے زیر کمان تھی۔ گزشتہ جنگ عظیم میں، صرف مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اگر اب کے جنگ چھڑی تو ایک بم، پورے کے پورے کرہ ارض کو بھک سے اڑا دے گا۔ ویبقیٰ وجہ ربك ذوالجلال والاکرام (۵۵/۲۷)۔ صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

یہ تو انسان کی سیاسی دنیا کی داستان خوں ریز تھی۔ اس کی فکری دنیا کی طرف آیئے تو وہاں بھی یہ عجیب مجموعۂ تضاد دکھائی دے گا۔ اگر ایک طرف اس نے یہ فلسفہ وضع کیا کہ ایک چیونٹی کا مارنا بھی مہاپاپ (گناہ عظیم) ہے، اور انسان کو منہ پر کپڑا باندھے رکھنا چاہئے، تاکہ جراثیم، سانس کے ذریعے اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائیں اور اس طرح انسان، جیو ہتیا کے جرم کا مرتکب نہ ہو جائے، تو دوسری طرف ہم نیٹشے کے الفاظ میں یہ سنتے ہیں کہ:

Men should be educated for war and women for the recreation of the warriors. Everything else is folly.

مردوں کو سپاہ گری کی تعلیم دینی چاہئے اور عورتوں کا مقصدِ زندگی، ان سپاہیوں کی تفریح کا سامان بننا۔ اس کے سوا جو کچھ ہے سب بکواس ہے۔ مسولینی کا قول تھا کہ جنگ بالکل اخلاقی چیز ہے۔ ہٹلر کہا کرتا تھا کہ اب ایک نئی دنیا وجود میں آ چکی ہے جس میں جنگ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنگ ہر شے کے ماپنے کا ذریعہ ہے اور قانون وہی ہے جسے ایک سپاہی وضع کرے۔ فرد اور معاشرے کے صرف وہی کام قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں جو جنگ کی تیاری میں مدد دیں۔

(Henrich Hauser) کا قول ہے کہ:

ہمیں چاہئے کہ ان تمام اداروں کو توڑ ڈالیں جو انسان کو امن اور حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ زندگی صرف اسی وقت محکم اور سادہ ہو سکے گی جسے بربریت کا عہد کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس افراط و تفریط میں، قرآن، اس سلسلہ میں، کیا فلسفہ پیش کرتا ہے؟

امن و سلامتی کا دین

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بالعموم ہر شخص امن اور سلامتی چاہتا ہے۔ جو لوگ اس سلسلہ میں کوئی نمایاں کام کرتے ہیں، دنیا کی ہر قوم انہیں واجب العزت سمجھتی اور ان کے مجسمے کھڑے کرتی ہے۔ ہر سال، کسی نہ کسی کو امن (Peace) کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے خدا کی ایک صفت **السلام** اور دوسری **المومن** بتائی ہے۔ **السلام** کے معنی ہیں وہ ذات جس سے ہر شے سلامتی حاصل کرے اور **مومن** کے معنی ہیں، امن کی ضمانت دینے والا۔ جس پر بھروسہ کر کے امن اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ خود اس نظام زندگی کا نام جسے قرآن پیش کرتا ہے، اسلام ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں سلامتی کا یہ نظام متشکل ہوتا ہے، انہیں مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اس ضابطۂ حیات (قرآن) کے متعلق، جو اس نظام کا آئین و دستور ہے کہتا ہے کہ یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلٰم (۱۶/۵)۔ اس کے ذریعے خدا سلامتی کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ وہ اس کی دعوت کے متعلق کہتا ہے کہ واللہ یدعو الی دارالسلٰم (۱۰/۲۵)۔ خدا سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ مومنین کے مآل زندگی کے متعلق کہتا ہے

کہ لھم دارالسلٰم (۶/۱۲۸) ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے۔ وہ جس معاشرہ میں رہتے ہیں، وہ معاشرہ امن اور سلامتی کا گہوارہ ہے اور اس دنیا سے جانے کے بعد، فرشتے ان کا یہ کہہ کر استقبال کرتے ہیں کہ سلٰم علیکم بما صبرتم (۱۳/۲۴) تم نے دنیا میں، امن وسلامتی قائم رکھنے کے لئے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس کے بدلے میں یہاں تمہارے لئے امن وسلامتی کے تحائف ہیں۔ یہی امن وسلامتی کی حسین آرزو ہے جو صبح سے شام تک، ہر مسلمان کے وردِ زبان رہتی ہے جب وہ آنے والے کا استقبال، ''**السلام علیکم**'' کی صدائے نشاط افزا سے کرتا، اور اس کے جواب میں، **وعلیکم السلام**، کی نشیدِ جاں فزا سنتا ہے۔

فساد ناپسندیدہ ہے

جب معاشرہ کے امن اور سلامتی کی فضا میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو اسے ''فساد'' کہا جاتا ہے، جو خدا کو بے حد ناپسند ہے۔ واللہ لا یحب الفساد (۲/۲۰۵)۔ وہ انسانوں کو تاکیداً حکم دیتا ہے کہ لاتفسدوا فی الارض (۵۶/۷) زمین میں فساد مت برپا کرو۔ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادًا (۲۸/۸۳) ان کا مسلک، دنیا میں سرکشی اور فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام، امن وسلامتی کا پیامبر ہے اور دنیا میں فساد اور خلفشار کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منتہائے نگاہ، دنیا سے فساد ختم کر کے، عالمگیر امن اور سلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے۔

لیکن سرکشی کا کیا علاج

یہاں تک تو بات صاف ہے کہ ہر شخص امن اور سلامتی میں رہنا چاہتا ہے، اور اسلام امن وسلامتی کا پیامبر ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کو امن کے ساتھ نہ رہنے دے، اور معاشرہ کی سلامتی کو بگاڑنے کی کوشش کرے، تو اس وقت کیا کیا جائے؟ اس کا جواب، ہمارا ہر روز کا تجربہ اور طرزِ عمل دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکات پر اتر آتا ہے تو سب سے پہلے اسے سمجھایا بجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہیں آتا تو اسے حوالہ پولیس کر دیا جاتا ہے اور جب عدالت اسے مجرم پاتی ہے تو اسے قید کر دیا جاتا ہے، تاکہ امن پسند لوگ، اس کی شرانگیزی سے محفوظ رہیں۔

یہ تو ہوا کسی کا انفرادی فعل۔ لیکن اگر کوئی قوم اس قسم کی حرکات کرنے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟

عیسائیت کی تعلیم

عیسائیت کی مروجہ تعلیم یہ کہتی ہے کہ ایسی صورت میں چاہئے کہ اس قوم کی زیادتی کو برداشت کیا جائے۔ اس کے سامنے ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح وہ خود ہی نادم اور پشیمان ہو کر اپنی زیادتی سے باز آجائے گا۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا۔ جو شخص تمہارا کوٹ اتارے، اسے واسکٹ خود اتار کر دے دینا۔ اس طرزِ عمل کو ظالم کی درازدستیوں کا علاج بتایا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ تجربہ پر صحیح ثابت نہیں ہوتی اور خود عیسائیت کی تاریخ اس کی عملاً تردید کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈین انگے (Dean Inge) جو دنیائے عیسائیت کا ایک نامور ترجمان

ہے۔ اپنی کتاب (The Fall of Idols) میں لکھتا ہے:

عدمِ مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گلّے کے لئے ناموافق حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظّم سوسائٹی تشدد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنے حدودِ مملکت میں کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہئے اور جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کو دشمن کے حملہ کی مدافعت کرنی بھی ضروری ہوگی۔ فتنہ و فساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کسی آئین و قانون کی پیروی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب ہوتی ہے.......... عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؟ ایک بڑے پیمانے پر قزاقی۔ (صفحہ ۱۷۵)۔

موجودہ اناجیل میں بھی بعض شہادات ایسی ملتی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی حقیقی تعلیم، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی نہیں تھی۔ مثلاً انجیل متی کے دسویں باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔

مہاتما گاندھی کا اہمسا

خود ہمارے زمانے میں، ہندوستان میں، مہاتما گاندھی نے اہمسا (عدم تشدد) کا پرچار بڑے شد و مد سے کیا اور اسے ایک خدائی فلسفۂ حیات کے طور پر پیش کیا۔ لیکن جب ملک میں عام بدامنی پھیلی اور عورتوں تک کی عزت خطرہ میں نظر آئی، تو انہیں مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ:

بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں محسوس کریں کہ وہ بے بس ہیں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے اور عورتوں میں خنجر اور ریوالور رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔ (ہری جن بابت ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء)

یعنی اہمسا کے پجاری کو یہاں تک کہنا پڑا کہ مرد تو ایک طرف، عورتوں کو بھی تشدد کا استعمال کرنا چاہئے یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیش نظر، علامہ اقبالؒ نے اسی زمانے میں کہا تھا کہ:

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اور اسی رشی کے چیلے، آج کل بھارت میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اس کے پیش کردہ فلسفہ کے بطلان کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن سطحی جذبات کو اپیل کر کے دوسروں کو وقتی طور پر خوش اور مطمئن نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے حقائق کا سامنا کرتا اور ان کا عملی حل پیش کرتا ہے۔

برائی کی روک تھام بھلائی سے

اس نے، سب سے پہلے تلقین کی کہ جہاں تک ہو سکے، برائی کو بھلائی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك وبینه عداوة کانه ولی حمیم o

(۴۱/۳۴)۔

برائی کی مدافعت نہایت حسن کارانہ انداز سے کرو۔ اس سے یہ ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے، وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

دوسرے مقام پر اس نے مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ:

یدرء ون بالحسنة السیئة (۲۸/۵۴)۔

وہ برائی کو بھلائی سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ جن سے نادانستہ برائی سرزد ہو جائے اور شریفانہ طرزِ عمل ان پر عمدہ اثر کرے۔

جرم کی سزا

لیکن اگر اس سے کام نہ چلے، اور جس سے شرافت کا سلوک کیا جاتا ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے، تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی زیادتی کی روک تھام قوت سے کی جائے، لیکن اس کا خیال رکھا جائے کہ سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے۔ اس کا ارشاد ہے۔ وجزاء سیئة سیئة مثلها۔ جرم کی سزا، جرم کے مطابق ہونی چاہئے۔ لیکن یہاں بھی قرآن ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس موقع پر بھی دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے اور اگر اسے معاف کر دیا جائے تو اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے: فمن عفا واصلح فاجرہ علی الله انہ لا یحب الظٰلمین ٥ (۴۲/۴۰)۔ غور کیجئے! قرآن اس شخص کو بھی ظالم قرار دیتا ہے جو ایسے مجرم کو معاف نہ کرے جو اپنے کئے پر نادم ہو اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہو۔ اس سے اگلی آیت میں، اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جہاں فرمایا کہ: ولمن انتصر بعد ظلمہٖ فاُلئك ما علیهم من سبیل ٥ جو شخص اس ظلم کا بدلہ لیتا ہے جو اس پر کیا گیا ہو، اس پر کوئی الزام نہیں۔ انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق۔ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ یہ لوگ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد ہے: ولمن صبر و غفر ان ذالك لمن عزم الامور ٥ (۴۲/۴۱-۴۳)۔ لیکن جو شخص دیکھے کہ عفو اور درگزر کر دینے سے، مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے، تو وہ اگر ہمت سے کام لے اور مجرم کو سزا سے بچا لے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

قرآنی اقدامات

آپ نے غور فرمایا کہ معاشرہ میں امن قائم رکھنے کے لئے قرآن، کیا کیا اقدامات تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(۱) دوسروں کے امن میں خلل ڈالنے والوں کو، سب سے پہلے، حسن سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ ان میں اگر شرافت کا مادہ ہے تو یہ حسن سلوک ان کی اصلاح کر دے گا۔

(۲) اگر یہ تدبیر مؤثر ثابت نہ ہو، تو انہیں ان کے جرم کی سزا دی جائے۔ لیکن سزا، جرم سے بڑھنے نہ پائے۔

(۳) اگر دیکھا جائے کہ مجرم اپنے کئے پر نادم ہے، اور معاف کر دینے سے اس کی اصلاح کا امکان ہے تو اسے معاف کر دیا جائے۔

(۴) لیکن جو لوگ ناحق ظلم اور زیادتی کریں، اور معاشرہ کے امن کو بگاڑیں۔ اور ان میں اصلاح کے امکانات بھی نہ ہوں، تو انہیں سزا دی جائے۔ یعنی ان کی زیادتی کی روک تھام کے لئے قوت کا استعمال کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں، **السلام** اور **المؤمن**، خدا کی صفات بتائی ہیں، ان کے ساتھ المهیمن

العزیز الجبار المتکبر (۵۹/۲۴)۔کا بھی اضافہ کر دیا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ قیام امن و سلامتی کے لئے' بعض اوقات قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

قانون کے ساتھ شمشیر کا نزول

اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تنہا قانون' امن قائم رکھنے کے لئے کافی نہیں۔اس کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہے۔ سورۂ حدید میں ہے۔لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت ۔اوران کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا اور میزان عدل بھی لیقوم الناس باقسط تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس (۵۷/۲۵)۔اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فولاد بھی پیدا کیا جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور یہ لوگوں کے لئے بڑی منفعت بخش چیز ہے کیونکہ اس کی سختی سے دنیا کا امن قائم رہتا ہے۔علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار
اُس بیت کا یہ مصرعہ اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے' اسرار

جس قانون کی پشت پناہ قوت نہیں' وہ قانون وعظ و نصیحت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔قانون مؤثر ہی اسی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ قوت نافذہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ اسلام' جو ایک نظام زندگی کا نام ہے' عملی شکل اختیار کرنے کے لئے' ایک آزاد مملکت کا وجود ضروری سمجھتا ہے۔اگر اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو وہ ''مذہب'' بن کر رہ جاتا ہے۔دین کی صورت اختیار نہیں کر سکتا اور اس مملکت کی حفاظت' وہ اپنا اولیں فریضہ قرار دیتا ہے۔اسی لئے اس نے جماعت مؤمنین سے تاکیداً کہا ہے کہ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم ..... (۸/۶۰)۔جہاں تک بھی تمہارے بس میں ہو' قوت پیدا کر کے اور گھوڑوں کے رسالے تیار رکھ کر' دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو اور اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرو' تا کہ اس طرح مستعد رہ کر' تم اپنے اور نظام خداوندی کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو' اور وہ تمہاری طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔

لیکن یہ قوت' اس مملکت کی حفاظت کے لئے ہو گی جس میں نظام خداوندی نے ایک عملی شکل اختیار کر کے' امن عالم کو قائم رکھنا ہے۔اسے کمزور قوموں کو لوٹنے اور کچلنے کے لئے صرف نہیں کیا جائے گا۔اس حقیقت پر قرآن کا وہ مقام شاہد ہے جہاں سب سے پہلے' مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔اسے غور سے سنئے:

جنگ کی پہلی اجازت

نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین' نے تیرہ برس مکہ میں گزارے' اور مخالفین کے جور و ستم کو کامل صبر و سکون سے برداشت کیا۔ان کی طرف سے ہر برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔لیکن اس سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔۔۔۔۔۔۔۔ان کی طرف سے شدائد اور مصائب کا سلسلہ دن بدن زیادہ ہوتا چلا گیا۔حتیٰ کہ' حق پرستوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنا گھر بار چھوڑ کر' دور مدینہ میں جا کر پناہ لی۔لیکن ان مخالفین نے وہاں بھی انکا پیچھا نہ چھوڑا' اور تہیہ کر لیا کہ یا تو انہیں مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی دعوت کو چھوڑ دیں اور یا ان کا خاتمہ کر دیا

جائے۔ چنانچہ وہ ایک لشکر جرار لے کر ان کے خلاف چڑھ دوڑے۔ اب اس جماعت کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ تھا وہ مقام جب انہیں پہلی مرتبہ میدان جنگ میں آنے کی اجازت دی گئی۔ سورہ حج میں ہے۔ اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا یہ لوگ جن پر اس قدر مظالم کئے گئے ہیں' اب' بالآخر انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ گھبرائیں نہیں: وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر o خدا ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر ہے۔ ن الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔ ان پر مظالم اس انتہا تک پہنچ چکے تھے کہ ان بچاروں کو ان کے گھر بار سے بھی نکال باہر کیا گیا اور ناحق ایسا کیا گیا۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب' اللہ ہے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں ان کے وطن سے نکال دیا گیا اور اب جب کہ یہ دیار غیر میں آ کر پناہ گزیں ہوئے ہیں تو انہیں یہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سرکش قوتوں کو بدلگام ہونے دیا جائے یا ان کی روک تھام کا کچھ انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومسجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔ اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش قوتوں کی روک تھام کچھ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہو' تو پھر دنیا میں کوئی امن کی جگہ باقی ہی نہ رہے' حتیٰ کہ مختلف اہل مذاہب کی پرستش گاہیں تک مسمار کر دی جائیں۔ راہبوں کی کوٹھڑیاں۔ یہودیوں کے صومعے' دیگر اقوام کی عبادت گاہیں۔ مسجدیں جن میں خدا کا نام بکثرت لیا جاتا ہے۔ یہ سب ڈھا دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے' ایسی جماعتوں کا وجود ضروری ہے جو عندالضرورت اپنی جان تک دے کر لوگوں کی مذہبی آزادی' برقرار رہنے کا انتظام کریں۔ ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز o (۲۲/۳۹-۴۰)۔ جو جماعت' اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے خدا کی مددگار بنے گی' خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اسلامی مملکت کی غرض وغایت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت' جسے سرکش قوتوں کی روک تھام کے لئے جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے' اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو اس کا طرز عمل کیا ہو گا؟ کیا اسکا غلبہ بھی اسی طرح' کمزوروں اور ناتوانوں کو کچلنے کے لئے ہو گا؟ قطعاً نہیں۔ الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اتوالزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور o (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں تمکن حاصل ہو گیا تو یہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں لوگ قوانین خداوندی کا اتباع کریں گے' اور ہر شخص کو سامان نشوونما حاصل ہو گا۔ یہ ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں خدا کا قانون صحیح قرار دے گا اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ کہے گا۔ ان کی حکومت میں' ہر معاملہ کا آخری فیصلہ' قانون خداوندی کے مطابق ہو گا۔ لہٰذا' اس میں کسی قسم کی سرکشی اور دھاندلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔

دوسرے مقام پر کہا گیا کہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض۔ اگر اللہ سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا رہے' تو دنیا میں فساد ہی فساد نظر آئے۔

ولٰکن اللہ ذو فضل علی العٰلمین o (۲/۲۵۱)۔لیکن خدا اس طرح اقوام عالم کو تباہ نہیں کرانا چاہتا اس لئے اس نے ایسی جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اپنا خون دے کر، امن عالم قائم رکھیں۔

مظلوموں کی مدد کے لئے

لہٰذا، قرآن کریم کی رو سے، جنگ کی اجازت ان لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں سرکش قوتیں کہیں جینے نہ دیں۔ وہ ان قوتوں سے مدافعت کے لئے جنگ کر سکتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بچاروں میں اتنی سکت نہ ہو کہ یہ اپنی مدافعت کر سکیں تو پھر کیا ہو؟ کیا اس صورت میں انہیں، ان جفاجُو درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں۔ ان مظلوموں اور لاوارثوں کی مدد کی جائے اور ان کی حفاظت کے لئے عندالضرورت، میدان جنگ میں اترا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جماعت مومنین سے کہا جاتا ہے کہ ومالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں نکلتے۔والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا۔ تم سنتے نہیں کہ کمزور اور ناتواں مرد، عورتیں، بچے کس طرح چلا چلا کر پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندوں نے اس قدر ظلم برپا کر رکھا ہے۔واجعل لنا من لدنك ولیا واجعل لنا من لدنك نصیراً o (۴/۷۵)۔ وہ فریاد کر رہے ہیں کہ ہمارے لئے کہیں سے کوئی سرپرست پیدا کر دے۔کوئی مددگار بھیج دے جو ہمیں ان کے مظالم سے نجات دلائے۔کیا ان کی فریاد تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی، یا تم نے سمجھ لیا ہے کہ چونکہ اب ہم محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔تمہارا مقصد زندگی اپنی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر مظلوم کی حفاظت ہے۔ظلم کی روک تھام تمہارا فریضۂ زندگی ہے۔اس لئے جہاں سے مظلوم کی آواز اٹھے گی، تمہیں اس کی مدد کے لئے پہنچنا ہو گا۔ یہی جنگ **"قتال فی سبیل اللہ"** اللہ کی راہ میں جنگ ہے۔ الذین اٰمنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغت (۴/۷۶)۔ جماعت مومنین ظلم کی روک تھام کے لئے، خدا کی راہ میں جنگ کرتی ہے اور جو لوگ حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں، وہ ظلم اور سرکشی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔

جائز اور ناجائز جنگ

قرآن کریم نے یہاں جنگ کے مقاصد میں اصولی اور بنیادی فرق بتا کر، یہ واضح کر دیا کہ کس مقصد کے لئے جنگ، جائز بلکہ ضروری ہو جاتی ہے، اور کن مقاصد کے لئے ناجائز اور باطل۔ اگر جنگ، ظلم مٹانے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لئے ہو تو جائز۔اگر ظلم برپا کرنے کے لئے ہو تو ناجائز۔ظلم کسے کہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت وضاحت سے خود ہی بیان کر دیا ہے۔تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی گروہ، کسی بات کو یونہی ظلم قرار دے کر، آمادۂ پیکار ہو جائے اور اپنے آپ کو برسرحق قرار دے لے۔قرآن اپنی کسی بات کو مبہم اور وضاحت طلب چھوڑتا ہی نہیں لیکن یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق، میں مختلف مواقع پر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ جن امور کو قرآن "بنیادی حقوق انسانیت" قرار دیتا ہے کسی انسان یا انسانوں

کے گروہ کو ان سے محروم کر دینا، ظلم قرار پائے گا۔ اور اس کی روک تھام جماعت مومنین کا فریضہ ہوگا، خواہ یہ ظلم کسی پر بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں ہوگی۔

دشمن سے عدل

یہاں تک سوال، جنگ کی ضرورت۔ مقاصد۔ جواز یا عدم جواز کا تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ جنگ کی صورت میں، قرآن، جماعت مومنین پر کن شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عدل کا دامن، جنگ میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جائے گا۔ دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ اس کا تاکیدی حکم ہے۔ ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلو ھو اقرب للتقوٰی واتقو اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون o(۵/۸)۔ دیکھنا! کسی قوم کی تمہارے خلاف دشمنی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ دشمن سے بھی عدل کرو۔ یہی طرز عمل تقویٰ سے قریب تر ہے۔ عدل ظلم کی ضد ہے۔ لہٰذا، جب ظلم کے معنی ہیں، کسی کو انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینا، تو عدل سے مراد ہوگی، ان حقوق کی حفاظت کرنا۔ بنابریں، قرآن کریم کی رو سے، جنگ کی حالت میں بھی دشمن کو حقوق انسانیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کا عام چلن یہ ہے کہ جنگ اور معاشقہ میں ہر حربہ جائز ہے (Every thing is fair in love and war) لیکن قرآن اسے حدیث بے خبراں قرار دیتا ہے اس کے نزدیک، عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دینا، جنگ میں بھی جائز نہیں۔

معاہدات کی اہمیت

اب آگے بڑھئے۔ جنگ ہو یا صلح، ان میں معاہدات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا امن، معاہدات کے بھروسے پر قائم رہتا ہے۔ معاہدہ باہمی اعتماد کی ضمانت ہوتا ہے۔ لیکن جب اصول یہ قرار دے لیا جائے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے، تو پھر معاہدات کا احترام کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان کے مشہور مقنن، سولن نے کہا تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو تو پھانس لیتا ہے لیکن قوت والے کے سامنے پرکاہ کی سی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور مغربی سیاست کا امام، میکیاولی یہ تعلیم دیتا ہے کہ:

> عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا پیمان اس کے خلاف جاتا ہے یا جن مصلحتوں کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نظر فریب دلائل بھی بہم پہنچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ فریب جس سے مقصد حاصل ہو، قابل تعریف ہوتا ہے۔

اور اس امام کے مقتدی، فریڈرک دوم کا قول ہے کہ:

> حکمت عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمت عملی یہ ہے کہ حسب موقع، جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے، اسے اختیار کر لیا جائے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہئے۔ اگر کبھی کسی سے معاہدہ کر بھی لیا جائے تو اسے حسب مصلحت توڑ ڈالنا چاہئے۔

اٹلی کے میکیاولی سے بہت پہلے، بھارت (ہندوستان) میں ایک

میکیاولی گزرا ہے جس کا لقب ہی کوٹلیہ (Kautilya)۔ یعنی فریب کار۔ ہے۔ وہ اپنی کتاب' ارتھ شاستر میں لکھتا ہے کہ :

> معاہدات کو وقتی مصلحتوں کے تابع رہنا چاہئے اور عندالضرورت ان سے بلاتوقف پھر جانا چاہئے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے کرنا چاہئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی کو تمہاری چال کا علم نہ ہونے پائے۔

ہندوستان' اپنے اس سیاسی گرو کے اپدیش (نصیحت) پر کس طرح حرفاً حرفاً عمل کر رہا ہے' اس پر اس کی نصف صدی کی سیاسی تاریخ شاہد ہے اور ایک ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے۔ دنیا کا ہر ملک یہی کچھ کر رہا ہے۔

معاہدہ کا احترام

ان سب کے برعکس' قرآن کریم نے معاہدات کی پابندی پر جس قدر زور دیا ہے' اس پر اس کا ایک ایک متعلقہ مقام شاہد ہے۔ اس نے اصولی تاکید کی کہ اوفوا بالعقود (۵/۱)۔ عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی کرو۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ معاہدہ کرنے کے بعد تم ایفائے عہد کے لئے' صرف اس پارٹی کے سامنے جوابدہ ہو جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے۔ تم اس کے لئے اپنے خدا کے سامنے بھی جوابدہ ہو۔ اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا (۱۷/۳۴)۔ عہد کی پابندی کرو۔ یاد رکھو! تم سے عہد و پیمان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن کے ان تاکیدی احکام کی روشنی میں' جماعت مومنین کی طرف سے' معاہدات میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فریق مخالف' خیانت پر اتر آئے' تو پھر کیا کیا جائے؟ اسکا جواب عام طور پر یہی دیا جائے گا کہ پھر تم بھی اسی قسم کا طرز عمل اختیار کرو۔ لیکن قرآن کی یہ تعلیم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ واما تخافن من قوم خیانۃ۔ اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا خطرہ ہو تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر' یونہی معاہدہ کالعدم نہ کر ڈالو۔ فانبذ الیھم علیٰ سواء تم انہیں اسکی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو اور اس طرح دونوں فریق برابر کی سطح پر آ جاؤ۔ "علی سواء" کے یہ معنی بھی ہیں کہ اگر اس طرح یک لخت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اس کی تلافی کر کے' ان سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ ان اللہ لا یحب الخائنین (۸/۵۹) اللہ معاہدات میں خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

عملی مثالیں

ہماری تاریخ کے اس عہد ہمایوں میں' جب قرآنی نظام قائم تھا' کسی بین الاقوامی معاہدہ میں خیانت کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں' انفرادی عہد و پیمان کا بھی کس حد تک احترام کیا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ بدر کے میدان میں حالت یہ تھی کہ ادھر' تین سو تیرہ' قریب قریب نہتے اور بے ساز و یراق مجاہدین کی صف۔ مقابل میں قریش کا جم غفیر۔ اتنے میں دیکھا کہ دو صحابیؓ' کہیں سے دوڑے دوڑے آئے اور مجاہدین کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ اس وقت حالات اتنے نازک تھے کہ اسلامی لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی موجب تقویت تھا۔ مجاہدین کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آ رہے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کے لئے جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ

اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ میدان جنگ تک پہنچ سکے ہیں۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا کہ جب تم نے ان سے جنگ میں عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے فکر نہ کرو۔ ہماری اللہ مدد کرے گا۔

یہ تو پھر بھی ایسے عہد کی پابندی ہے جو' بہ حالات مجبوری ہی سہی' مخالفین سے کر لیا گیا تھا۔ قرآن کریم اس باب میں اس سے بھی دو قدم آگے جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد' ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بعض عورتیں مسلمان ہو گئیں۔ لیکن ان کے خاوند' ہنوز غیر مسلم تھے ان کفار کی طرف سے ان مسلمان بیویوں پر جو مظالم ہوتے ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ یہ عورتیں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر' کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ میں آ جاتی تھیں اور اس طرح ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھیں۔ ان عورتوں کے متعلق قرآن نے کہا کہ انہیں واپس تو نہ بھیجو کیونکہ ان حالات میں' ان مسلم عورتوں کا' ان کفار کے نکاح میں رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا' لیکن اٰتوھم ما انفقوا (۶۰/۱۰)۔ انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا تھا' وہ انہیں ادا کر دو۔ غور کیجئے! آپ کو ایفائے عہد اور عدل و انصاف کی' اس قسم کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

صُلح

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے' جس قوم سے جنگ چھڑ جائے' اس جنگ کو کب تک جاری رکھا جائے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ فریق مخالف جس وقت بھی صلح کی طرف جھکے تم اس کی طرف جھک جاؤ۔ اس وقت یہ نہ کہو کہ ہماری فتح ہونے لگی تھی تو دشمن نے صلح کی درخواست پیش کر دی۔ اب ہم صلح کیوں کریں۔ ہم انہیں مفتوح و مغلوب بنائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انداز نگاہ غلط ہے۔ جنگ سے تمہارا مقصد نہ مال غنیمت تھا نہ کشور کشائی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سرکش قوتیں اپنی سرکشی سے باز آ جائیں۔ سو وہ جس وقت بھی سرکشی چھوڑ کر' قانون کے سامنے جھک جائیں' تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ وان یریدوا ان یخدعوك فان حسبك اللہ (۶۲/۸)۔ اگر' بفرض محال' وہ صلح کی درخواست کی آڑ میں تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہوں' تو تمہیں پھر بھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ قانون خداوندی تمہاری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ تم اپنی طرف سے پوری پوری احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔ لیکن ان کی صلح کی درخواست کو اس بدگمانی کے ماتحت مسترد نہ کر دو کہ وہ اس باب میں نیک نیتی سے کام نہیں لے رہے۔

جنگ کب تک جاری رکھی جائے

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کے لئے آمادہ نہ ہوں' تو جنگ کب تک جاری رکھی جائے۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ (۳۹/۸)۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ فتنہ فرو ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ جنگ کی گئی تھی' تو جنگ ختم کر دو۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' جنگ سے مقصد فتنہ ختم کرنا تھا۔ لفظ فتنہ کے اندر ہر قسم کی سرکشی۔ استبداد۔ جور و ستم۔ مذہب کے معاملہ میں سختی اور زبردستی آ جاتے ہیں۔ یہ تو رہا صلح کی صورت میں' یا فتنہ فرو ہو جانے کی شکل میں جنگ کا اختتام۔ لیکن قرآن کریم' جنگ کے دوران میں' امن و سلامتی کی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آ جاتی ہے۔

جنگ کا التوا

جنگ اسی صورت میں جاری رکھی جاسکتی ہے کہ فریقین اپنی اپنی قوم اور سپاہیوں کے دل میں، فریق مخالف کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات برابر مشتعل کرتے رہیں۔ اگر کسی طرح جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے، تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا اور پھر ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے ہمارے زمانہ میں متارکہ (یا Cease-Fire) کا طریق وضع کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے، آج سے بہت پہلے، متارکہ کے اصول کو قوانین جنگ کے ضابطہ میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ بین الاقوامی معاہدہ کی رو سے، یہ طے کر لینا چاہئے کہ، سال میں کچھ مہینے ایسے رکھے جائیں گے جن میں جنگ بہرحال ملتوی کر دی ہوگی، خواہ وہ کہیں بھی ہو رہی ہو۔ منہا اربعۃ حرم (۹/۳۶)۔ سال کے بارہ مہینوں میں چار ایسے ہیں جن میں لڑائی یکسر بند رہے گی۔ ظاہر ہے کہ جب، سال میں کچھ وقت کے لئے لڑائی بہرحال بند ہوگی تو جذبات منافرت و عداوت کی آگ کی شعلہ زنی خود بخود ماند پڑ جائے گی اور یہ فضا قیام امن و صلح کے لئے بڑی سازگار ہوگی۔

جنگ کے قیدی

جنگ کے سلسلے میں ایک اہم سوال جنگ کے قیدیوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ روش، زمانہ قدیم سے چلی آ رہی تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔ نزول قرآن کے وقت، عربوں میں یہی رواج تھا۔ چنانچہ ان کے معاشرہ میں، غلام اور لونڈیاں عام ملتی تھیں اور اسے ذرا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے آ کر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ کسی انسان کو، غلام بنا لینا، اسے حق انسانیت سے محروم کر دینا ہے، جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب۔ جب مخالفین سے تمہارا مقابلہ ہو، تو جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے، ان کی سرکوبی کرو۔ حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق۔ پھر جب وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کر لو۔ فاما منا بعد و اما فداء (۴۷/۴)۔ اس کے بعد، یا تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ اور یا فدیہ لے کر۔ آپ دیکھئے کہ بات کس قدر صاف ہے۔ جنگ کے قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا۔ اگر تمہارے قیدی دشمن کے ہاں ہیں، تو ان کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دو، یا کچھ زر فدیہ لے کر اور یا محض احسان کے طور پر انہیں آزاد کر دو۔ بہرحال انہیں آزاد کرنا ہے۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اس میں آپ دیکھئے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لینے کا اشارہ تک نہیں اور ایسا ہو بھی کس طرح سکتا تھا۔ وہ قرآن جو فک رقبۃ (۹۰/۱۳)۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کو، جماعت مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ جو جنگ کی ضرورت ہی اس لئے قرار دیتا ہے کہ جن لوگوں کو حقوق انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے، انہیں وہ حقوق واپس دلائے جائیں۔ جو واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا غلام اور محکوم بنائے۔ کیا وہ قرآن اس کا حکم دے گا کہ جنگ میں قید ہونے والے انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح بیچا جائے! سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون جب تک جنگ کے قیدی، نظام اسلامی کی تحویل میں رہیں گے، ان کی حیثیت سرکاری مہمانوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ قیدی ہو کر بھی انسان تو رہتے ہیں اس لئے انہیں حقوق انسانیت

سے کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران میں ان سے کس قسم کا سلوک ہوگا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنگ بدر کے قیدیوں میں ایک شخص ابوعزیز تھا۔ اسکا بیان ہے کہ میں جس انصاری کے گھر میں بطور مہمان رکھا گیا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح شام کھانا لاتے' تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا' لیکن وہ اسے ہاتھ نہ لگاتے' اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

انہیں قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے' عام مجمعوں میں' نبی اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس شخص کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تا کہ یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ لیکن حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔

جنگ بدر کے قیدیوں کو زر فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جو ناداری کی وجہ سے زر فدیہ نہ دے سکے' ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ یہی ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ جو ایسا بھی نہیں کر سکتے تھے' انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زر فدیہ لیا گیا تھا ان سے بھی جاتے وقت کہہ دیا گیا کہ ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیراً یؤتکم خیرا مما اخذ منکم و یغفر لکم (۸/۷۰)۔ اگر اس کے بعد' اس مملکت کے متعلق تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات پائے گئے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے' تمہیں اس سے بہتر واپس دیا جائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان بھی کر دیا جائے گا۔

''غلامی اور اسلام'' ایک مستقل موضوع ہے۔ جس پر تفصیل سے گفتگو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ اس مقام پر ضمناً اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم میں' غلاموں اور لونڈیوں (ما ملکت ایمانکم کے ضمن میں جس قدر احکام اور ہدایات ہیں' وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام احکام ماضی کے صیغے (Past Tense) میں ہیں۔ ما ملکت ایمانکم۔ یعنی جو اس سے پہلے' غلام بنائے جا چکے تھے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جنہیں تم اس کے بعد غلام بناؤ' ان کے متعلق یہ احکام ہیں۔ قرآن نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو جو اس وقت اس معاشرہ میں موجود تھے' آہستہ آہستہ یا آزاد کرا دیا اور یا انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا اور اس کے بعد غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ لیکن اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ ہمارے ارباب مذہب' اب بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اسلام میں دشمن کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کی اجازت ہے اور اگر اب بھی پاکستان کی جنگ کسی اور ملک سے ہوئی تو ہم ان کے مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (تفہیم القرآن۔ از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ص ۳۴۰)۔

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب

خواہ کوئی ہو۔ بہرحال جب وہ تقسیم کردی جائیں گی تو جن کے حصے میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔ (تفسیر تفہیم القرآن۔صفحہ ۳۴۰)۔

یعنی نکاح تو صرف مسلمان عورتوں سے یا اہل کتاب کی عورتوں سے ہوسکتا ہے' کفار اور مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ لیکن جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے لئے یہ بھی شرط نہیں کہ وہ اہل کتاب سے ہوں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔

حتیٰ کہ جن لوگوں کے حصے میں یہ لونڈیاں آئیں گی انہیں اس کا بھی اختیار ہوگا کہ استعمال کرنے کے بعد انہیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کردیں۔ چنانچہ اس باب میں تحریر ہے کہ:

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے۔ اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ (تفہیمات۔حصہ دوم۔صفحہ ۳۲۳)۔

یہ ہے جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں اور ان کی عورتوں کے ساتھ وہ سلوک جسے ہمارے یہ حضرات اسلام کا منشاء اور حکم قرار دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

بہرحال' یہ بات ضمناً سامنے آ گئی تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے حکم یہ دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو اور یا بطور احسان۔

پناہ میں آنے والے

یہ تو ان لوگوں کے متعلق ہے جو مغلوب و مفتوح ہو کر گرفتار ہو جائیں۔ لیکن جو لوگ' مسلمانوں کی پناہ میں آنا چاہیں' ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ' اس کی کشادہ نگہی کی زندہ شہادت ہے۔ آج کل ایک نئی ٹیکنیک رائج ہوئی ہے جسے (Brain Washing) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو شخص تمہارے قابو آ جائے۔۔ خواہ وہ تمہارے اپنے لوگوں میں سے ہو اور اس کے خلاف کوئی بدگمانی ہو' یا دشمن کا کوئی آدمی۔۔ اسے دردناک عذاب کی بھٹیوں میں سے اس طرح گزارو کہ اس کے تمام سابقہ خیالات اس کے دماغ سے محو ہو جائیں اور وہ اسی طرح سوچنے لگ جائے جس طرح تم چاہو۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلم اللہ اور اگر مخالفین (مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے اپنے ہاں پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اگر قرآن کی تعلیم اسے اپیل کرے اور وہ دل کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہے تو خیر۔ لیکن اگر وہ اس کے بعد چلے جانا چاہے تو اسے روکو نہیں بلکہ ابلغہ مامنہ اسے' اپنی حفاظت میں' اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ ذلک بانھم قوم لا یعلمون o (۹/۶) اس لئے کہ یہ لوگ جاہل ہیں۔ جانتے نہیں کہ قرآن انہیں کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ لیکن قرآن کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاتا۔ اس لئے اگر یہ بطیّب خاطر' قرآن کو ماننا نہیں چاہتے' تو انہیں' اپنی حفاظت میں' ان کے مامن تک پہنچا دو۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کس قدر بلند اور انسانیت ساز ہے؟

جنگ کا خاتمہ

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن کریم جنگ کو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے لاینفک قرار دیتا ہے یا ایسے معاشرہ کا بھی تصور دیتا ہے، جس میں جنگ کا امکان نہ رہے۔ وہ ایسے معاشرہ کا تصور دیتا ہے جو آیت اوپر درج کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب تمہیں حق کی مدافعت کے لئے میدان جنگ میں نکلنا پڑے تو دشمن کی سرکوبی کرو۔ اور جب ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو بقیہ السیف کو قید کرلو۔ اور قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہے حتیٰ تضع الحرب اوزارھا (۴/۴۷) تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآن جس جنتی معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی زندگی بخش اور امن افروز صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں ہر انسان، دوسرے انسان کی سلامتی کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ ایسی انسانیت ساز فضا کس طرح پیدا کرتا ہے جس میں بدامنی کا خدشہ تک نہ ہو، ایک الگ موضوع ہے جو تفصیل چاہتا ہے۔ اسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ وہ ان غیر فطری حدود و خطوط کو مٹا کر، جن کی بناء پر انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ رہا ہے، تمام انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکل کر دینا چاہتا ہے اور اس کی بنیاد ایک مشترکہ آئیڈیالوجی قرار دیتا ہے جسے دنیا کا ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرے۔ جب تک ایسی فضا پیدا نہ ہو، وہ ان سرکش قوتوں کے مقابلہ کے لئے، جو دوسروں پر ظلم کریں، جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔۔ خواہ یہ ظلم جماعت مومنین کے خلاف ہو، یا دنیا کے کسی اور انسان یا انسانوں کے گروہ کے خلاف۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے جنگ کا مقصود، دنیا سے ظلم مٹا کر اس کی جگہ نظام عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ترمذیؒ کی ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ اسی طرح بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے۔ ایک شخص ذاتی انتقام کے لئے لڑتا ہے۔ ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا کہ: من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیاء فھو فی سبیل اللہ۔ جو اس لئے لڑتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون غالب رہے، اس کی جنگ، اللہ کی راہ میں ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین، صرف اپنے گروہ کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور چونکہ انسان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے باہمی مفاد میں تصادم ہوتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے۔ خدا، رب العالمین۔ تمام انسانوں کا یکساں نشوونما دینے والا ہے، اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین کی رو سے، تمام انسانوں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر امن عالم کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کو توحید کہا جاتا ہے یعنی تمام انسانوں پر ایک خدا کے قوانین کا اقتدار۔ جو نظام اس بنیاد پر متشکل ہوتا ہے، اسے قرآن کریم دین کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نظام زندگی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس، اب، رفتہ رفتہ، خود مغرب کے مفکرین کو بھی ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب (The Crisis of Civilisation) میں، عصر حاضر کے ہمہ گیر اضطراب پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد، آخر میں لکھتا ہے کہ:

> دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آ رہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔

مسٹر ایمری ریوز (Emrey Reves) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

> کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد، انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کرہ ارض کو کسی

ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح، جمہوری انداز سے اس اقتدار واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے، ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہئے جن پر یہ اقتدار قائم ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہئے تاکہ یہ مقصود خون ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ (Anatomy of Peace)

یہ خیال اب دنیا کے چیدہ چیدہ مفکرین تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر (W.A.Gauld) نے اپنی کتاب (Man, Nature & Time) میں کچھ عرصہ پہلے لکھا تھا کہ:

مجھے تسلیم ہے کہ ''گھر اور وطن'' کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے ابھی تک اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا، اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسن ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت کہ کم وبیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے، اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔

اگر اس قسم کے عالمگیر نظام کا احساس زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا، تو اس کی ذمہ دار (فلہٰذا) انسانیت کی بارگاہ میں مجرم) وہ قوم ہے جسے اس عالمگیر نظام کا تصور، آج سے چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، قرآن نے اس زمانے میں کہا تھا کہ کان الناس امۃ واحدۃً (۲/۲۱۳) انسانی معاشرہ کی آخری شکل یہی ہونی ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری بن جائیں۔ اس کے علاوہ، دنیا میں امن وسلامتی کی کوئی صورت نہیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے تمام نوع انسان کے لئے دین۔۔ یعنی نظام زندگی۔۔ بھی ایک تجویز کیا گیا۔ قرآن سے پہلے، مختلف انبیاء کرامؑ کسی خاص قوموں کی طرف آتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہوا کہ قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا (۷/۱۵۸) ان سے کہہ دو کہ میں تمام نوع انسان کی طرف رسول ہوں۔ یہی وہ بنیاد ہے، جس پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ خود قرآن کریم کے متعلق بھی کہا گیا کہ یایھا الناس قد جاء تکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور (۱۰/۵۷)۔ اے ساری دنیا کے انسانو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جس میں تمہاری تمام الجھنوں کا علاج ہے۔ انسانی مشکلات کا علاج ہی یہ ہے کہ تمام انسان ایک برادری کی شکل میں زندگی بسر کریں اور اس کا طریق یہ ہے کہ ان سب کا ضابطۂ قوانین ایک ہو۔ یہ تھا وہ تصور حیات جو امت مسلمہ کو چودہ سو سال پہلے دیا گیا تھا، لیکن اس نے اس تصور کو اس طرح پس پشت ڈال رکھا ہے کہ آج جبکہ دنیا کی دیگر اقوام کے دل میں یہ خیال، کسی نہ کسی انداز سے کروٹیں لے رہا ہے، یہ اس سے اس طرح بے بہرہ ہے گویا اس کی آواز تک کبھی اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ لیکن قرآن کے ان تصورات پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری تھوڑی ہے کہ کوئی دوسرا ان میں شریک نہیں ہو سکتا؟ یہ تو سورج کی روشنی کی طرح، فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہے ان سے بہرہ یاب ہو جائے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اس نظام کا گہوارہ

پاکستان کا خطۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہ اس عالمگیر نظام انسانیت کا اولیں گہوارہ بنے اور یہاں سے اس شجر طیب کی شاخیں پھوٹیں جو دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں پر، امن وسلامتی کا سایہ کریں۔ یہی وہ نظام تھا جس کے متعلق اعلان کیا

گیا تھا کہ من دخلہ کان آمنا (۳/۹۶)۔ جواس میں داخل ہوگیا' اسے امن نصیب ہو جائے گا اور جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ قیاما للناس (۵/۹۷)۔ یہ انسانیت کے قیام کا باعث ہے۔ یہی وہ امن عالم کی ضمانت دینے والا نظام ہے کہ اگر سرکش قوتیں' عالمگیر مفاد انسانیت کے خلاف' اپنے ذاتی مفاد کی خاطر' اس کے قیام کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جائیں' تو انہیں راستے سے ہٹایا جائے اور اسکے لئے اگر جنگ ناگزیر ہو تو اسے اسی طرح روا رکھا جائے جس طرح' ڈاکٹر ایسی انگلی کو مجبوراً کاٹ ڈالتا ہے جس کا ناسور لا علاج ہو چکا ہو' اور جس کا زہر' سارے جسم میں سرایت کئے جا رہا ہو۔ قرآن' قوت کے استعمال کی اسی مقصد کے لئے اجازت دیتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

تاریخ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

''دین کی حفاظت'' سے مراد ہی عالمگیر انسانیت کے نظام امن و سلامتی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں اسی مقصد کے لئے جنگ کی اجازت ہے۔ جو جنگ' استبداد اور جوع الارض کی تسکین کے لئے کی جائے' وہ جنگ حرام ہے: ؎

صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض' جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند
(اقبالؒ)

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

محمد رفیق ثانی

جمہوریت اور ہم

ایک بار پھر ہم الیکشن کے نزدیک ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے مسائل کا حل انتخابات کروا کر ڈھونڈ لیتی ہیں۔ جبکہ ہمارے لئے ہر انتخاب نئے مسائل، نئے وسوسے، نئے خدشات حتیٰ کہ نئے المیوں کا موجب بن جاتا ہے (جیسے سقوط ڈھاکہ)۔ ایک بار پھر نئے نئے قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ قوانین بنانے کا اختیار کس کو ہے اور کس کو نہیں ہے؟ قوانین بنانے، انہیں تبدیل کرنے اور انہیں مروڑنے کی سب بات کرتے ہیں جبکہ اصل میں یہاں قوانین توڑنے، بلکہ قوانین کو روندنے پر زور ہے۔ ہر قانون شکن یہاں ہیرو ہے، ہر وہ شخص جو قانون، عدلیہ، اور اداروں کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہے بزعم خود ہمارا رہنما ہے۔ جبکہ تجربے اور تاریخ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اور قومیں قوانین پر عمل کرتی ہیں اور ہر دم اپنے عمل اور قول کو ترازو پر رکھتی ہیں وہی کامیاب و کامران رہتی ہیں۔ جو قومیں قوانین پر عمل نہیں کرتیں انہیں آسمانی صحیفہ بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ جیسے کہ قرآن کریم جیسی آسمانی کتاب بلا کسی تحریف کے اپنی اصل اور مکمل حالت میں ہمارے پاس موجود ہے لیکن کیونکہ ہم اس پر عمل نہیں کرتے چنانچہ وہ آسمانی کتاب بھی ہمیں فائدہ پہنچانے کی پابند نہیں ہے۔ وہ تو اسی کو فائدہ پہنچاتی ہے جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر نہ چلے وہ بے شک جہنم میں جائے اللہ اس کا رسول، اور کتاب اللہ ان سب سے بے نیاز ہے۔ جو قومیں قوانین پر عمل کرتی ہیں وہ متمدن کہلاتی ہیں اور جو قومیں قوانین پر عمل نہیں کرتیں وہ جاہل اجڈ اور گنوار کہلاتی ہیں۔ جو قومیں قوانین پر عمل کرتی ہیں وہ اپنے تجربے کی روشنی میں قوانین پر نظر ثانی کرتی جاتی ہیں اور یوں مشکل اور پیچیدہ قوانین آسان اور قابل عمل ہوتے جاتے ہیں۔ جو قومیں قوانین پر عمل نہیں کرتیں وہ اپنی ناکامیوں کی روشنی میں قوانین کو مزید سخت اور پیچیدہ بناتی جاتی ہیں اور یوں وہ ناقابل عمل ہوتے جاتے ہیں۔

تاریخ عالم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تقریباً ہر حکمران عوام کے لئے پیرتسمہ پا ثابت ہوتا ہے یا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ پیرتسمہ پا کی اصطلاح عربی کی مشہور داستان، الف لیلیٰ سے لی گئی ہے۔ روایت کے مطابق سند باد جہازی کا جہاز سمندر میں غرق ہو جاتا ہے اور سمندر کی لہریں سند باد کو ایک ویران جزیرے پر پٹخ دیتیں ہیں۔ اس ویران جزیرے پر سند باد کی ملاقات ایک شخص سے ہوتی ہے جو پیروں سے معذور ہوتا ہے۔ سند باد اس کی معذوری پر ترس کھا کر اسے اپنے کندھے پر بٹھا لیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تم جزیرے سے آشنا ہو لیکن پاؤں سے معذور ہو میرے پاؤں ٹھیک ہیں لیکن میں رستے سے ناآشنا ہوں۔ تمہارا علم اور میری طاقت ہم دونوں کو منزل پر پہنچا دیں گے۔ دونوں کا سفر شروع ہو جاتا ہے بہت سفر کے

بعد جب سند باد تھک جاتا ہے تو وہ معذور شخص کو کندھے سے اتار کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہے لیکن اب معذور شخص اپنی باریک باریک ٹانگوں کو سند باد کی گردن کے گرد تسموں کی صورت لپیٹ لیتا ہے اور سند باد سے کہتا ہے کہ اگر تم نے مجھے اپنے کندھوں سے اتارنے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا اب مجبوراً سند باد اس شخص کو ہر وقت کندھے پر اٹھائے رکھتا ہے۔ میری رائے میں اس ظالم' سفاک' عیار و مکار اپاہج نکمے شخص (یا گروہ) کو اپنے کندھوں سے اتار کر زمین پر پٹخ دینے کا نام ہی جمہوریت ہے۔

تاریخ عالم' کیا اسلامی اور کیا غیر اسلامی' اس بات کی گواہ ہے کہ مختلف طریقوں سے برسر اقتدار آنے والے عوام کے کندھوں پر جب سوار ہو گئے تو پھر موت نے یا کسی بڑے المیے نے ہی انہیں عوام اور رعایا کے کندھوں سے اتارا۔ بلکہ بعض تو جاتے جاتے کسی اور کو عوام کے کندھوں پر سوار کر گئے۔

نام نہاد مسلمانوں کی تو بات ہی کیا دور جدید میں کمیونزم اور سائنسی سوشلزم کے دعوے دار بھی کسی شخص کو اقتدار میں لانے کے بعد اسے اقتدار سے نکالنے کا مسئلہ حل نہ کر سکے۔ لینن۔ اسٹالن' خروشیف' برزنیف جو بھی برسر اقتدار آیا اپنی موت تک قوم کے کندھوں پر سوار رہا۔ حتیٰ کہ سویت یونین کا بہادر شاہ ظفر' یعنی گورباچوف برسر اقتدار آیا تو ایک ملک جو دنیا میں سب سے بڑا ملک تھا' وہ پندرہ ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔

انقلابی کیوبا کا فیڈرل کاسترو ۴۰ سال سے زائد عرصے سے برسر اقتدار ہے اور اس کا جانشین ایک سوالیہ نشان ہے۔ معمر قذافی' صدام حسین' حسنی مبارک' شاہ فہد' سلطان النہیان اور دوسرے' طویل عرصے سے برسر اقتدار ہیں اور شاید قضا ہی انہیں اقتدار سے الگ کرے۔ یعنی کسی بھی طرح برسر اقتدار آ گئے تو جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

کہنے کو تو جمہوریت ایک نظام حکومت ہی ہے لیکن دوسرے تمام نظام ہائے حکومت کے مقابلے میں اسے یوں افضلیت حاصل ہے کہ بقیہ تمام نظام حکومت اقتدار میں آنے یا لائے جانے کے بارے میں تو بات کرتے ہیں لیکن اقتدار سے جانے' ہٹائے یا نکالے جانے کے راستے اور طریقے نہیں بتاتے یہ صرف اور صرف جمہوریت کی ہی خوبی ہے کہ وہ اقتدار میں آنے یا لانے کے نہ صرف اصول و ضابطے اور قوانین بتاتی ہے بلکہ اقتدار سے جانے کا وقت' نکالے جانے' یا ہٹائے جانے کے طریقے' اصول اور ضابطے بھی بیان کرتی ہے۔

جمہوریت شخصیات کی نفی کرتی ہے اور اداروں کو پروان چڑھاتی ہے۔ شخصیات تھک جاتی ہیں' ادارے نہیں تھکتے۔ ادارے وقت اور حالات کے مطابق شخصیات کی تعمیر اور تربیت کرتے ہیں۔ انہیں ذمہ داریاں دیتے ہیں اور جب ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی ذمہ داریاں واپس لے لیتے ہیں۔ ادارے اگر مضبوط ہوں تو شخصیت کی خودسری کی مزاحمت کرتے ہیں۔ جیسے سابق برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کو اس کی اپنی پارٹی نے آخری ٹرم پوری نہیں کرنے دی اور مارگریٹ تھیچر کو ہٹا کر جان میجر کو وزیراعظم بنا دیا گیا تھا۔

ہم نہیں جانتے کہ امریکی ڈیموکریٹ اور امریکی ریپبلیکن پارٹی کے سربراہ کون ہیں' لیکن ان دونوں پارٹیوں نے بل کلنٹن' اور بش جونیئر کو الیکشن جتوایا' یہ دونوں صرف اپنی اپنی ریاستوں کے گورنر تھے۔

روایت کے مطابق' امریکی صدر جارج واشنگٹن جب اپنی صدارت کی دوسری ٹرم پوری کر چکے تو ان کے بہی خواہوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ تیسری ٹرم کے لئے بھی الیکشن لڑے۔ جارج واشنگٹن کا جواب تھا کہ تم لوگ امریکہ میں جمہوریت چلانا چاہتے ہو یا بادشاہت؟ اگر بادشاہت چلانا چاہتے ہو تو میں اس کے حق میں نہیں اور اگر جمہوریت چلانا چاہتے ہو تو میں اپنی ٹرم پوری کر چکا' اب دوسروں کی باری ہے۔ یہ پچھلے دور کی بات تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نکسن' فورڈ' جمی کارٹر' رونالڈ ریگن' جارج بش اور بل کلنٹن امریکہ کی صدارت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اپنا اپنا کام کیا اور گھر چلے گئے۔ صدر ریگن نے سرد جنگ جیت کر امریکہ کو پوری دنیا میں سرخرو کر دیا۔ امریکہ کا مقابل سوویت یونین' جو دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا' دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ جارج بش نے عراق پر حملہ کیا' اور پورا مشرق وسطیٰ امریکہ کی جھولی میں آن گرا۔ صدر کلنٹن نے اپنے دور صدارت میں امریکہ کو اقتصادی اور مالی طور پر دنیا اور تاریخ کا خوشحال ترین مالدار ترین ملک بنا دیا۔ ان کے دور حکومت میں بیروزگاری اور افراط زر امریکی تاریخ کی نچلی ترین سطح پر پہنچ گئے تھے۔ تھے بھی ابھی جوان' اگر ہمارے ملک میں ہوتے تو شاید تاحیات صدر ہوتے۔ لیکن وہ امریکی صدر تھے۔ قاعدے کے مطابق اپنی ٹرم پوری کی اور ایوان صدر خالی کر دیا۔

قوانین پر عمل درآمد کی مثالیں صرف امریکہ میں ہی نہیں موجودہ روس کے سابق صدر بورس یلسن نے اپنے دور صدارت میں چار وزراء اعظم کو برطرف کیا جن میں سے ایک کو تو دو بار وزیراعظم بنا کر برطرف کیا۔ آئین تھا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے غیر قانونی کام کیا ہے۔ خود بورس یلسن اپنی ٹرم پوری کر کے گھر چلے گئے۔ روس میں نہ ایجی ٹیشن ہوا نہ آئین بدلا گیا۔ بلکہ جو آئین تھا' سب نے خود کو اس کا تابع کر لیا۔ نتیجتاً' روس میں آج ایک مضبوط حکومت ہے۔ دور کیوں جائیں ہمارے رہنماؤں میں تو کوئی چندر شیکھر' دیوگوڈا اور آئی کے گجرال بھی نہیں' مذکورہ رہنماؤں کو جب جب اقتدار ملا تو انہوں نے اپنا استعفیٰ ہر وقت اپنی جیب میں رکھا۔ جب بھی انہیں محسوس ہوا کہ ساتھیوں کے اعتماد میں کمی آ رہی ہے' انہوں نے اقتدار چھوڑنے میں دیر نہیں لگائی۔

جمہوریت نام ہے قانون پر عملدرآمد' آئین کی پاسداری اور دلیل و منطق کے ذریعے لوگوں کی ہمنوائی کا۔ اگر کوئی دلیل و منطق کے بغیر لوگوں کو اپنا مطیع بناتا ہے تو وہ کچھ اور تو ہو گا جمہوریت نہیں۔ ہماری جمہوریت اور انتخابی تجربات کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما' غلام محمد' ایوب خان' یحییٰ خان' ذوالفقار علی بھٹو' ضیاء الحق' نواز شریف اور بے نظیر بھٹو راگ تو جمہوریت کا الاپتے رہے لیکن عملاً انہوں نے اقتدار سے چمٹے رہنے کو ترجیح دی ان کی صلاحیتیں اپنے' اپنے اقتدار کو دوام دینے' اپوزیشن کو روندنے اور فنا کرنے میں صرف ہوئیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر نے اپنے اپنے بنائے ہوئے آئین و قانون پر عمل کرنے کے بجائے اس کی دھجیاں بکھیرنے کو ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ ادوار کی اپوزیشن نے بھی صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اچھے برے' جائز و ناجائز میں تمیز کئے بغیر ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

جمہوریت کے اصول ناکام نہیں' بلکہ ہم ان اصولوں پر عمل کرنے میں ناکام رہے ہیں ہمیں چاہئے کہ اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے جمہوری اصولوں کی من مانی تشریحوں سے گریز کریں۔ اور قانون و اخلاق کی پابندی کریں اور زمین کا بوجھ نہ بنیں ورنہ۔

جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہو گا' یہی ہے اک حرف محرمانہ!
قریب تر ہے نمود جس کی' اسی کا مشتاق ہے زمانہ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوظفر عبدالواحد ایم۔اے

اقبال کا ذہنی ارتقاء

آج اقبال کی شاعری اور ان کے کمال کے چاروں طرف گن گائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے حوصلے کے مطابق ان کی شاعری اور شعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے جیتے جی بھی لوگوں نے ان کے دلفریب اور جوش انگیز شعروں کو بہت کچھ سراہا اور جی کھول کر داد دی۔ مگر اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں، ان کی ہر اک ادا، ان کی دل میں وہ کھبنے والی باتیں اور بھی یاد آتی ہیں۔ قدرِ نعمت بعدِ زوال!

یہ طرفداری نہیں اگر میں یہ کہوں کہ اقبال جیسا شاعر اردو زبان نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال سے پہلے جتنے شاعر اردو زبان نے پیدا کئے ان میں کوئی خوبی نہ تھی۔ مثال کے طور پر انیسؔ اور غالبؔ کو لیجئے جو اقبالؔ سے کچھ ہی پہلے کے شاعر ہیں۔ دونوں نے اردو کو کہاں سے کہاں پہنچایا۔ یا اکبرؔ اور حالیؔ کو لیجئے جو عین اس زمانے کے شاعر ہیں جب کہ اقبالؔ نے پر تولنے شروع کئے تھے۔ اکبر کی شاعری کا شگفتہ رنگ اور ہنسی ہنسی میں دل میں نشتر چبھونا، یا حالی کا ملک اور قوم کا دکھڑا بیان کرنا، کون ہے جو نہیں جانتا؟ ان دونوں کے مقابلے میں داغ بھی تھے جو اتنے پائے کے شاعر نہ تھے۔ کہنے کو پرانی لکیر پر چلتے تھے مگر زبان ایسی بانکی پائی تھی کہ سنئے تو دل لوٹ پوٹ ہو جائے۔ پھر ذرا غور سے دیکھئے تو وہی روندا روندایا خیال، مگر بیان کرنے کا ڈھب ایسا کہ بے واہ واہ کہے بَن نہ پڑے۔ یہ شاعری نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک آدمی کو آپ پرانی وضع اور دقیانوسی خیال کا آدمی سمجھیں، لیکن جب وہ کچھ کہے تو آپ بے اختیار پھڑک اٹھیں، داغ شاعر تھا۔

میں نے یہ سب ذکر یوں ہی بے سبب نہیں کیا۔ ان تینوں چاروں شاعروں کا اثر شروع میں اقبال پر پڑتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنی نومشقی اور تقلید کے دور سے گزر کر اقبال نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا اور ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا جہاں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کے باوجود بھی اقبال نے سدا اپنے پیشروں کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اوچھے ہیں وہ جو اپنے محسنوں کے احسان کو بھول جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ بڑا آدمی ناشکرا نہیں ہوتا۔ اقبال نے غالب، داغ، حالی اور فارسی زبان کے بڑے بڑے شعراء کی بڑائی کو مانا ہے اور عقیدت کے طور پر ان لوگوں پر نظمیں لکھی ہیں جن سے اس کی نیک نیتی صاف جھلکتی ہے۔ خصوصاً غالب، داغ اور حالی پر جو نظمیں ''بانگ درا'' میں ہیں، انہیں پڑھ کر اپنے طور پر اندازہ کر لیجئے کہ ایک بڑا آدمی اپنے بڑوں کی بڑائی ماننے سے کبھی نہیں جھینپتا اور تو اور شیکسپیئر پر بھی ایک پیاری نظم ہے، حالانکہ شیکسپیئر ہماری زبان کا شاعر نہیں۔ اسی طرح بعض

ہندو بزرگوں کی سیرتوں پر بڑی دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً سوامی رام تیرتھ، بھرتری ہری، رام چندر جی، لچھمن جی اور گرونانک وغیرہ۔

بہرحال، اکبر اور حالی اور خاص طور پر داغ اور حالی کی شاعری کا ہندوستان کے چاروں طرف غلغلہ تھا جب کہ اقبال نے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا احساس کیا اور چپکے چپکے شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کے تمام ہونہار شاعروں کی طرح پہلے پہل غزل گوئی ہی سے شاعری کی ابتدا کی۔ داغ کی شاعری اور زبان دانی کی چاروں طرف دھوم تھی، وہی عاشقانہ رنگ اختیار کیا۔ لوگ دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے مرعوب تھے۔ پنجاب اور سیالکوٹ کی زبان دانی تو خیر کسی شمار قطار میں نہ تھی، ہندوستان کے دوسرے علاقے جہاں اردو کا چرچا تھا، دہلی اور لکھنؤ سے سند لیتے تھے۔ ایسی صورت میں اقبال کسی اہل زبان کا دامن نہ تھامتے تو کیا کرتے لامحالہ استاد داغ کا دامن تھاما اور ان سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ دنوں تک خط و کتابت کے ذریعے یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کو داغ نے سیر چشمی سے کام لے کر ہمت بندھائی اور لکھا کہ تمہیں اب اصلاح کی ضرورت نہیں، تم جوہر قابل رکھتے ہو، اپنی طبیعت کے بہاؤ پر چلو، خود ہی اپنا راستہ نکال لو گے۔

اسی زمانے یا اس سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ کیسے جوہر شناس تھے۔ سیالکوٹ سے ایف۔اے پاس کر کے اقبال لاہور آئے تھے، بی۔اے میں پڑھ رہے تھے، شعر گوئی کا سودا زوروں پر تھا، غزلیں کہتے تھے اور بعض اوقات خوب مضمون نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر سنئے لاہور میں ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں اس زمانے کے خاص خاص شاعر جمع تھے اقبال کے بعض بے تکلف دوست انہیں جبراً یہاں لے آئے اور غزل پڑھنے پر مجبور کیا۔ مرزا ارشد گورگانی میر مشاعرہ تھے۔ جب اقبال نے اپنی غزل کا ایک شعر پڑھا تو بے اختیار پھڑک اٹھے۔ شعر تھا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اسی غزل کا مقطع بھی ہے جو ہمارے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے اور جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہونے والا ایک بڑا شاعر کس قدر اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہے، حالانکہ بڑائی کی منزل ابھی دور ہے:

ہم کو تو لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہے غرض
اقبالؔ ہم اسیر ہیں زلفِ کمال کے

کتنے پیمبرانہ الفاظ تھے جو ایک فیضانی کیفیت میں اقبال کی زبان سے نکلے۔ اس وقت کے سننے والوں نے اسے محض شاعرانہ بڑ اور تعلّی سمجھا ہو گا، لیکن ہونے والے اقبال نے جس کی شہرت ہندوستان سے باہر دور دور پہنچنے والی تھی، بعد کو یہ ثابت کر دکھایا کہ زبان دانی کا طلسم یوں توڑا جاتا ہے۔ خادم زبان اور ادیب ہونے کے لئے جوہر قابل کی ضرورت ہے۔ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیاں الانگنا ضروری نہیں۔

لیکن زبان کے الجھیڑوں سے آزاد ہونے سے پہلے اور بعد بھی اقبال ایک زمانے تک غالب کے زیر اثر رہے۔ گو کہنے کو انہیں داغ سے تلمذ تھا لیکن ذہنی اور معنوی حیثیت سے وہ غالب کے شاگرد تھے۔ اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمہ ہے۔ اقبال غالب کے اتنے گرویدہ کیوں تھے؟ اس کے کئی ایک سبب ہیں۔ غالب کی طرح اقبال بھی جدت اور انوکھے پن کے حامی تھے۔ غالب ہی کی طرح فلسفیانہ طبیعت پائی تھی۔ فلسفۂ قدیم و

جدید کے مطالعہ نے ان کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا کر دی تھی۔ انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم کی واقفیت نے مختلف اسالیب پر عبور حاصل کرنے میں ان کی مدد کی تھی۔ جرمن زبان کی واقفیت کے باعث جرمن ادب کے شاہکاروں پر براہ راست انہیں عبور حاصل تھا۔ سنسکرت زبان بھی جانتے تھے اور اس طرح سنسکرت لٹریچر کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ فارسی کا پوچھنا کیا۔ ''بیاورید گراین جابود زباں دانی'' کا دعویٰ نہیں کیا' لیکن وہ کر دکھایا کہ ایک مغرور ایرانی بھی ان کا نام ادب سے لیتا ہے۔ غرض کہ اقبال ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑے عالم بھی تھے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ شاعری ان کی کنیز بن کر رہی۔ یہ جامعیت اردو کے شعراء میں تو کیا' دنیا کے اور باکمالوں میں بھی کم ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اقبال کی شاعری کو غالب کی شاعری کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ غالب کی شاعری میں جو کمی تھی' اقبال نے اس کو پورا کیا۔

بہرحال ایک زمانے تک اقبال غالب کے زیر اثر رہے اور نومشقی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی جب کہ غالب کی عقیدت مندانہ تقلید چھوڑ کر انہوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا تھا' یہ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے غالب کے دیئے سے دیا جلایا اور جس منزل پر غالب نے چند ناتمام نقوش چھوڑے تھے' اقبال نے وہاں سے ابتدا کی اور چند اضافوں کے ساتھ اسے بامِ تکمیل پر پہنچایا۔

انگریزی کی ایک مشہور مثل ہے کہ ''شاعر اپنے عہد کا بچہ ہوتا ہے''۔ عہد ماضی کا جو اثر اقبال پر ہوا' وہ تو ابھی میں بتا چکا' اس انگریزی مقولے کی روشنی میں اب یہ بتانا ہے کہ ''اپنے عہد'' کا اقبال پر کیا اثر ہوا۔ اس مضمون کا بقیہ حصہ اسی رخ کی تصویر ہے۔

جس زمانے میں پورے طور پر اقبال نے اپنی شعری استعداد کا احساس کیا' ہندوستان کی سیاسی فضا قومیت اور آزادی کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ تلک اور کھوکھلے ''ہوم رول'' کا مطالبہ کر رہے تھی گاندھی جی اور برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کا زمانہ ابھی نہ آیا تھا' پھر بھی خاصے جوش وخروش کا زمانہ تھا۔ سیاسی پلیٹ فارم پر دھواں دھار تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ کانگریس نے بھی قومیت کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ سرسید کی پرخلوص کوششیں بار آور ہو چکی تھیں۔ حالی کی نوحہ خوانی کچھ رنگ لا رہی تھی۔ ''اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے۔'' کی تان سے مسلمانوں میں اپنی زبوں حالی کا احساس ہو چلا تھا۔ گو ''قلب کو گرمانے'' اور ''روح کو تڑپانے'' والی آواز ابھی فضا میں پیدا نہ ہوئی تھی اور دعاؤں نے ''شکوہ'' کا رنگ اختیار نہ کیا تھا' تاہم ہندوستان کا یہ تھکا ہارا قافلہ چونک رہا تھا۔ غرض کہ یہ کچھ معاشری اور سیاسی حالات تھے۔ یہ تذبذب اور انتشار کا زمانہ تھا جب کہ اقبال نے چند نظمیں مثلاً ہندی ترانہ' نیا شوالہ' ہمالہ' میرا وطن وہی ہے اور تصویر درد لکھیں اور تمام ہندوستان اس نئے شاعر کی والہانہ تانوں سے گونج اٹھا۔

ان نظموں کے علاوہ جو ملک کی سیاسی حالت کی ترجمانی کرتی ہیں' اس دور کی چند اور نظمیں بھی ہیں جو اقبال کی افتادطبیعت' ذہنی بے چینی' تجسس اور تلاش کا پتہ دیتی ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ابھی اپنی زندگی کا مقصد پایا نہیں' خودی کا احساس ابھی تیز نہیں ہوا اور وہ اسرار اس پر منکشف نہیں ہوئے جن سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ حُبِ وطن کے سہانے گیت گا کر دلوں کو گرماتا ضرور ہے لیکن خود اس کے دل میں تذبذب اور شکوک کا ایک طوفان برپا ہے۔ اس کا دل سراپا تجسس اور استفسار بنا ہوا ہے۔ وہ زندگی اور

حقائق زندگی کی عقدہ کشائی کرنا چاہتا ہے۔ چاروں طرف اس کی نگاہیں پڑتی ہیں مگر کسی طرف سے اس کی دلجمعی نہیں ہوتی۔ کہیں گل کی رنگینی کو دیکھ کر وہ حسن کی کشش کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے' کہیں شمع و پروانہ کی دل سوز حکایت میں وہ حسن و عشق کی حقیقت پانے کی دھن میں رہتا ہے۔ کبھی فراز آسمان پر مہر و ماہ کی جانب اس کی نظریں دوڑتی ہیں' لیکن کہیں سے خاطر خواہ جواب نہیں پاتا۔ گو بظاہر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے دل کو سمجھانے کے حیلے بہانے تراش لیتا ہے۔ گل رنگین' شمع و پروانہ' بچہ اور شمع' آفتاب' ماہِ نو' جگنو' چاند' ستارے' کنارِ راوی' موجِ دریا۔ یہ تمام نظمیں غور سے پڑھئے' آپ کو اقبال کی اس تلاش اور بے چینی کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ سب جستجو محض اسلئے تھی کہ اقبال اپنے لئے ایک بڑا نصب العین اور مقصد حیات متعین کرنا چاہتے تھے۔ ایک نئے راستے کی لگن ان کے دل میں تھی۔ وہ مفسر حیات بننا اور زندگی اور موت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ابھی انہیں اپنے پر کامل بھروسہ نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی پورے طور پر انہوں نے خود کو پہچانا ہے۔ ابھی ابھی جن نظموں کے عنوانوں کا حوالہ میں نے دیا ہے' ان کے کچھ اشعار سنئے آپ کو بہتر اندازہ ہوگا کہ میں کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

(بچہ اور شمع)

☆☆☆

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
مطمئن ہے تو' پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ شوقِ جستجو رہتا ہوں میں

(گلِ رنگین)

☆☆☆

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے' لیکن کھڑا ہوا ہوں میں
رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موجوں سے ملاح جس کا گرم ستیز
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

(کنارِ راوی)

☆☆☆

میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا' عدم آباد' وطن ہے میرا
صبح کا دامنِ صد چاک' وطن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقیِ موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت نہ یہ عزت' نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

(ستارۂ صبح)

☆☆☆

پروانہ اک پتنگا' جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب' یہ روشنی سراپا
نظارۂ شفق کی خوبی زوال پر تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی روشنی دی
یہ چاند آسماں کا' شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ' یاں درد کی کسک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے' وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہے
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہے؟

(جگنو)

☆☆☆

پھر بھی اے ماہِ مبیں' میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے' وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں' سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دُور تو

(چاند)

☆☆☆

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(موجِ دریا)

☆☆☆

نور کا طالب ہوں' گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

(ماہِ نو)

☆☆☆

یہ ناصبوری' یہ تڑپ' یہ ذوقِ آگہی' یہ نور کی طلب اور یہ وسعت کی خواہش' سب کیا ہے؟ وہی ایک اعلیٰ نصب العین کی تلاش جس کی صلاحیت شاعر خود میں نہیں پاتا۔ غرض کہ کچھ اس قسم کی کھٹک اور خلش دل میں لے کر اقبال یورپ کا عزم کرتے ہیں اور وطن کو خیرباد کہنے سے پہلے حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے آستانے پر حاضری دیتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر یہ بندِ جذبات پھوٹ پڑتے ہیں۔ چنانچہ اپنی منظوم التجا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اس خیال سے یورپ جا رہے ہیں کہ شاید وہاں انہیں اپنے ذوقِ استفہام کا جواب اور دل کی اس بے تابی کی دوا ملے:

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
پھر آرکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

یہ طلب اور یہ ارادے لے کر ۱۹۰۵ء میں اقبال ہندوستان سے رخصت ہوئے اور ان تاثرات پر اس دور کی شاعری کی تان ٹوٹتی ہے۔ بعد میں اقبال کی شاعری نے جو پلٹا کھایا اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

البتہ ایک چیز خاص طور پر نظر کے سامنے رکھنی چاہئے جو اس دور کی شاعری میں بھی نمایاں ہے اور آنے والے دور کی شاعری میں اور بھی شدت کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے' یہاں تک کہ آخر میں وہ ایک پیمبرانہ شان اختیار کر لیتی ہے۔ اس خاص چیز سے میری مراد اقبال کا گہرا مذہبی رنگ ہے۔ مذہب ان کی گھٹی میں تھا اور جس صوبے کی آب و گل سے اقبال کی سرشت کا ضمیر بنا تھا' مذہبی اعتبار سے پورا صوبہ اور علاقوں کے مقابلے میں شدت کے ساتھ مذہبی عصبیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ موجودہ حالات میں اقبال کا لہجہ بہتوں کے لئے غلط فہمی کا باعث ہوا اور بعض قوم پرستوں نے یہ سمجھا کہ ''اپنی محفل کا رند پرانا آج نمازی بن بیٹھا''۔ اصل حقیقت سچ پوچھئے تو یوں نہیں ہے' یہ ان کا نہیں بلکہ سمجھنے والوں کی سمجھ کا قصور ہے۔

اپنے تین سالہ قیام (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے زمانے میں جب کہ اقبال یہ کچھ توقعات لے کر شراب علم کے حصول میں نگارخانۂ وطن سے یورپ کی سرزمین پر پہنچے اور وہاں کے حالات اور رنگ ڈھنگ کا غور سے مطالعہ کیا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ قومیت جس کا پودا ہندوستان میں لگایا جا رہا تھا' یورپ میں خاصی بدنام اور خودغرضی کی مترادف ہو چکی تھی۔ جغرافی حد بندیوں نے نسل و رنگ کے امتیازات پیدا کر کے انسانوں کو تنگ نظری کا شکار بنا دیا تھا۔ مادیت اور مادہ پرستی نے انسان کو انسانی ہمدردی اور روحانی و اخلاقی مسائل سے بیزار اور بے بہرہ کر دیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ جو کچھ ہو اور جو کچھ کہا جائے' سب اپنی ہی بھلائی اور ذاتی نفع کے لئے ہو۔ جمہوری نظام کی باگیں خطرناک قسم کے بنیوں اور خونخواروں کے ہاتھ آ گئی تھیں اور سرمایہ دار بڑی بے دردی کے ساتھ غریبوں کا خون چوس رہے تھے اپنے حصول مقصد کے لئے قومیں قوموں کے خلاف' جماعتیں جماعتوں کے خلاف اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف آستینیں چڑھا کر موقع کا منتظر تھا۔ جنگ کے ڈراؤنے بادل سروں پر منڈلا رہے تھے یہ کشیدگی اور تصادم کیا رنگ لانے والے تھے؟

ان حالات میں اقبال نے دیکھا کہ یہ قومیت اور وطنیت کا بھوت' انسانوں کو درندوں سے بدتر بنا کر رہے گا۔ غرضیکہ قومیت' مساوات اور تہذیب و شائستگی کے گیت گانے والی یہ قومیں' ایک طرف تو اپنوں ہی کے حلق پر خنجر چلانے پر تلی بیٹھی تھیں اور دوسری طرف یہ منصوبے ہو رہے تھے کہ جس طرح بن پڑے اپنے حصول مقصد کی خاطر مشرقی اقوام کو آہستہ آہستہ ہڑپ کر لیا جائے اور بسم اللہ ترکی اور ایران سے کی جائے۔ اسی مقصد کے مدنظر ترکی کے خلاف بلقان اور اٹلی کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا' جن میں برطانوی سیاست کا بھی درپردہ ہاتھ تھا۔ ''مریض یورپ'' کا ادھر یہ حال تھا' ادھر برطانیہ اور روس کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے ایران کی جان کے لالے پڑے تھے۔ ان واقعات اور احساسات کی تھوڑی سی جھلک آپ کو اقبال کی اس نظم میں بھی دکھائی دے گی جس کا عنوان ہے ''ہلالِ عید''۔ چند اشعار یہاں پیش کرتا ہوں:

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ' ان کی گرفتاری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ' آبرو والوں کی' تو
اور جو بے آبرو تھے' ان کی خودداری بھی دیکھ

سازِ عشرت کی صدا مغراب کے ایوانوں میں سُن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

☆☆☆

غرض کہ ان اسباب کی بنا پر اسلامی ممالک کی فلاح اور یک جہتی کی خاطر وہ تحریک شروع ہوئی جس کو ہمہ اسلامی تحریک یا ''پان اسلامزم'' کہتے ہیں۔ اپنے قیام یورپ کے زمانے میں اقبال اس تحریک کی حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے اور اپنی آنکھوں سے یورپ کی ہوس کاری اور بدنیتی کا منظر دیکھ کر انہوں نے ''ہمہ اسلامیت'' کو اپنی شاعرانہ سحر کاریوں کا موضوع بنانے کی دل میں ٹھان لی اور مشرقی اقوام کے سامنے قومیت اور عالمگیر برادری کا اعلیٰ تصور پیش کیا۔ پھر اپنی شاعری کے لئے وسیع تر میدان پیدا کرنے کی نیت سے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی رواداری' اسلام کا شان دار ماضی' اور اقوام عالم پر اس کے عظیم احسانات' یہ سب ایسی کھلی حقیقتیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اقبال نے اسلامی ممالک کو ان کے شان دار ماضی سے روشناس کرا کے' اگر ان کے سینوں میں عمل اور بیداری کی لہر دوڑا دی تو برا کیا کیا؟ پھر یہ کہ گو ''لَے'' حجازی تھی مگر کاہل رگوں میں خونِ حرارت دوڑانے میں یہ نوا سب کے لئے برابر تھی۔ اس میں ہندی اور ترکی' عجمی اور تازی' یا ہندو اور مسلمان کی کچھ تخصیص نہ تھی۔ لیکن سینوں کے کھوٹ نے اس درد اور خلوص بھری آواز کے معنی ہی کچھ اور لئے اور جس طرح ایک غلط فہمی یہ پھیلی کہ اقبال اردو سے بیزار ہو گئے اسی طرح بعض حلقوں میں یہ بدظنی بھی عام تھی کہ اقبال قوم پرست سے مسلم پرست اور ہوتے ہوتے کٹر فرقہ پرست ہو گئے حالانکہ اقبال کا پیام بیداری و عمل سب کے لئے ہے۔ جس طرح زبان (اردو سے فارسی) بدل گئی تھی مگر دل وہی تھا' اسی طرح قومیت کا ڈھانچہ بدل سا گیا تھا مگر روح وہی رہی تھی۔ بھلا جو شاعر قومیت اور رنگ' نسل اور ذات پات اور برتری اور کمتری کے جھگڑے مٹانے آیا تھا' کیا ہو سکتا ہے کہ وہ تنگ نظر اور فرقہ پرست ہو؟ اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں بڑی غلط فہمی ہوئی اور کوئی اللہ کا بندہ بروقت ایسا نہ کھڑا ہوا کہ اس بدظنی اور غلط فہمی کو اقبال کے جیتے جی دور کرتا۔ اس چیز نے اقبال کی مقبولیت اور شہرت کو بڑا صدمہ پہنچایا اور وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

بہرحال یہ اسباب ہوئے کہ اقبال نے ''قومیت'' کو چھوڑ کر ''ملیت'' کا راگ گایا اور مغرب کی عقیدت مندی کو چھوڑ کر اس کے خلاف جہاد شروع کیا اور چن چن کر اس کے عیب گنوائے۔ چنانچہ قیام یورپ کی چند نظموں کو چھوڑ کر (جن میں شکوک تجسس اور تلاش کا رنگ گہرا ہو گیا ہے) بعد کے دور کا تمام کلام یورپ کے خلاف احتجاج اور قومیت اور جمہوریت سے بیزاری کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہی ان کی زندگی اور شاعری کا واحد موضوع ہے۔

یورپ کے قیام کے زمانے میں اقبال نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کی مختلف ادبی اور لسانی تحریکوں اور لٹریچر کو غور کی نظر سے دیکھا تھا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی تہذیب کی ابتری اور تباہی کی ذمہ دار فارسی شاعری بھی تھی جس نے افلاطونی فلسفے کی موشگافیوں میں پھنس کر' حیات کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ سکون اور بے عملی کو مقصدِ حیات تصور کیا جانے لگا۔ افراد میں خودی اور خودداری کی بو نہ رہی اور ذلت و نکبت موجب فخر سمجھی جانے لگی۔ یہ روگ آہستہ آہستہ پوری قوم اور ملت کی رگ و

پے میں سرایت کرتا گیا۔ اردو ادب کچھ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ ایک تو براہ راست فارسی شاعری کے اثر سے اور پھر (سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد) اس ملک کے عام اثرات کی وجہ سے جو صدیوں غلامی میں بسر کر چکا تھا اور اہنسا اور تیاگ جس کی رگوں میں بسا ہوا تھا' اس مجہولیت نے ہندوستان میں بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ اس مجہولیت کے خلاف جہاد کرنا اور ہندیوں کی رگوں میں خون حیات اور عمل کی برقی لہر دوڑانا' اقبال کے نزدیک از بس ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے اپنا منظوم دستور العمل مرتب کیا جو اسرار خودی اور رموز بے خودی کے نام سے مشہور ہے۔ اسرار و رموز کا فلسفہ علاوہ اسلامی ممالک کے' ہندوستان کے لئے ایک خصوصی اپیل رکھتا تھا۔

اسرار خودی اور رموز بے خودی کے اوراق کی ترتیب سے پہلے اقبال نے کئی ایک پرجوش نظمیں لکھیں جن سے ان کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کا پتہ لگتا ہے۔ ان نظموں میں بعض اس زمانہ کی ہیں جبکہ جنگ بلقان کے شعلوں کا دھواں ہندوستان تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ شکوہ' فاطمہ اور جواب شکوہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو مسلمانوں کے امنڈتے ہوئے جذبات اور اس ذہنی ہیجان کی ترجمانی کرتی ہیں جو ترکی کی بقا اور فنا کے مسئلے پر مسلمانوں کے دلوں میں موج زن تھے۔ شکوہ اور جواب شکوہ میں نام نہاد قومیت پر کچھ چوٹیں بھی ہیں اور اس کے برخلاف اس عالمگیر اخوت اور انسانی برادری کی طرف اشارے بھی ہیں جو نسل' رنگ اور دوسرے امتیازات سے پاک ہو۔

اسی زمانہ (۱۹۱۲ء) میں شمع و شاعر لکھی گئی جو اس دور کی نظموں میں سب سے اچھی نظم ہے اور جس کو بانگ درا کا دل کہنا بجا ہے اقبال کا سارا فلسفۂ خودی یہاں سمٹ کر دل بن گیا ہے۔ فلسفے اور شعر کا یہ خوش گوار امتزاج یا تو یہاں ہے یا پھر بال جبریل کے ساقی نامے میں جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ان طویل نظموں کے علاوہ چند چھوٹی بڑی نظمیں اور بھی ہیں جن میں حیات اور فلسفۂ حیات کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے۔ وہ مسائل جو پہلے اور دوسرے دور کی نظموں میں شاعر کی نگاہوں میں چیستان معلوم ہوتے تھے اور اس کی ذہنی بے چینی کا باعث بنے تھے' ان کا عقدہ اب کھلتا جا رہا ہے۔ فراز آسمان پر پہلے کی طرح اس کی نظریں پڑتی ہیں تو وہی چاند اور ستارے جو اس کی حیرت اور پریشانیوں میں اضافہ کرتے تھے' اپنے سربستہ رازوں کو اب آہستہ آہستہ فاش کر رہے ہیں۔ قدرت کی ہر شے اسرار کے خزانے اگل رہی ہے۔ شاعر کے نالے آسمانوں کے اس پار پہنچ رہے ہیں اور خود شان کبریائی جب ازل و ابد کے بھید اس کے سامنے آئینہ کر رہی ہو تو بھلا ان چیزوں کی ہستی کیا ہے؟ بہرحال پہلے دور کی کم و بیش انہیں عنوان کی نظموں سے ان نظموں کا مقابلہ کیجئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہی چاند ہے' وہی شمع' وہی پروانہ' وہی موجِ دریا' وہی کنارِ جو' لیکن جو چیزیں پہلے گُم صم نظر آتی تھیں' اب ایک مردِ خود آگاہ کے سامنے حقائق اور حقائقِ زندگی کے اسرار اگل رہی ہیں۔ ان کو غور سے اپنے طور پر پڑھئے۔ طوالت کے خوف سے میں ان نظموں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔

غرض کہ ادھر یہ سب نظمیں تیزی کے ساتھ لکھی جا رہی تھیں جن میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحانات صاف جھلکتے ہیں اور ادھر فارسی زبان میں اسرار و رموز کے تانے بانے بھی درست ہو رہے تھے۔ پہلی مثنوی جنگ عظیم کے دھماکے کے ایک سال بعد

(۱۹۱۵ء) اور دوسری اس دھماکے کے خاتمے سے ایک سال پہلے (۱۹۱۸ء) شائع ہوئی۔

دونوں مثنویوں کا خاکہ' مولانا رومؒ کی لازوال مثنوی پر تیار کیا گیا ہے' وہی زبان' وہی بحر' وہی اسلوب' حتیٰ کہ باریک مسائل اور حقائق مجردہ کو سلیس اور عام فہم بنانے کے لئے حکایت اور ''ایلیگوری'' (تمثالیہ) میں بیان کرنے کا ڈھنگ بھی رومی ہی کا ہے۔ پہلی مثنوی کے تمہیدی حصے میں صاف طور پر اقبال نے پیر رومی سے اپنی بے اندازہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ چیز ہمیں اور اچنبھے میں ڈالتی ہے' خصوصاً جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بعض چوٹی کے مغربی حکما (کانٹ' ہیگل' برگساں وغیرہ) سے اس نے کچھ نہ کچھ فیض حاصل کیا ضرور ہے۔ پھر بھی' رومی کے مقابلے میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور تو اور' نٹشے کو بھی جس کے فلسفۂ حیات نے ایک حد تک اقبال پر اثر ڈالا تھا' وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ ''اس کا دل تو مومن کا ہے مگر دماغ کافر کا'' (قلب او مومن دماغش کافر است)۔

اقبال نٹشے سے اتنا بیزار کیوں ہے؟ اسکے دو سبب ہیں۔ (۱) یہ کہ نٹشے میں خاص طور پر اور حکمائے مغرب میں بیشتر' روحانیت کا فقدان ہے اور اقبال شدت سے روحانیت کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک روحانیت کی کمی ہی فساد کی جڑ اور ساری انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔ (۲) پھر یہ کہ اقبال خود فلسفی تھا۔ نقال تو تھا نہیں کہ بے سوچے سمجھے نٹشے کے فلسفے کی نقل اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بناتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا یہ صاف انکار اور برہمی اس بنا پر ہے کہ سمندر پار کے ''پنڈتوں'' اور خود ہمارے یہاں کے بعض مغرب زدہ احباب نے جوش ہمہ دانی میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ اقبال کا فلسفۂ خودی نٹشے کی نقل ہے۔ یہ سراسر زیادتی تھی' اس لئے کہ گو بظاہر اس کا فلسفہ نٹشے کے فلسفے سے مماثلت کے کچھ پہلو پیش کرتا ہے' لیکن محض اس بنا پر اس کو نٹشے کی نقل نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال کے فلسفے میں چند عناصر ایسے ہیں جو اس کے اپنے اور اس کی لگاتار کوشش اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ''کہیں سے کچھ قرض لینا اور سود بٹے کے ساتھ اصل میں اضافہ کرنا' سرقہ ہرگز نہیں!'' یہ فتویٰ ہے ملٹن کا جس پر بے دردوں نے کچھ اسی قسم کا بہتان باندھا تھا۔

غرض کہ ہیر پھیر میں بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ ہوں جن سے نہ صرف میرے خیال کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ جہاں کہیں اقبال نے نٹشے سے کچھ لیا بھی ہے تو اسے کیا سے کیا کر دیا۔''

کیا اقبال نٹشے کے زیر اثر ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے۔ وہ (اقبال) ہمیشہ مستعار چیز کو جلا دے کر ایک نئی اور انوکھی چیز بنا لیتا ہے۔ مثال کے طور پر اسرار خودی کی حکایت ''الماس و زغال'' کو لیجئے جو نٹشے کی تصنیف (ارشادات زردشت) کی ایک حکایت (''پتھر اور کوئلہ'') سے ماخوذ ہے۔ مگر چونکہ اقبال نٹشے سے بزرگتر شاعر ہے' اس نے پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا کہ الماس اس کا اپنا بن گیا۔..... نٹشے کی طرح اقبال بھی حریت فکر و فعل کا حامی ہے۔ اس نے نوجوانوں کو مقابلہ کرنے کی جرأت سے سرفراز کیا ہے۔ اس کی حیات افروز مثنویوں کا جو حیرت انگیز اثر ہوا ہے وہ شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے.....''

تاہم یہ مثنویاں جا بجا نومشقی کا پتہ دیتی ہیں' خصوصاً رموز بے خودی جس میں بے رس فلسفہ اور واعظانہ رنگ زیادہ ہے

اور شعریت کم۔ اپنے شاعرانہ کمال کے بہتر نمونے اقبال نے بعد میں پیش کئے جن کے آگے یہ مثنویاں پھیکی ہیں۔ البتہ اقبال کے شاعرانہ معتقدات کا مکمل دستور اور لائحہ عمل ہونے کی حیثیت سے ان مثنویوں کی بڑی اہمیت ہے۔

رموز بے خودی کی اشاعت کے ایک سال پہلے (جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا ہے) جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اس کے اثرات سب پر پڑے۔ اور جو ہارے وہ تو ہارے ہی تھے جو جیتے ان کی بھی برائے نام جیت رہی۔ جو بے تعلق رہے، وہ بھی کچھ نفع میں نہ رہے۔ ورسائی میں جرمن قوم کی ابدی غلامی کا سرخط تیار ہوا۔ ترکوں کا کوئی مستقبل نہ رہا۔ قسطنطنیہ پر ''اتحادیوں'' کا فوجی قبضہ تھا۔ سلطان وحیدالدین خاں کی نام نہاد خلافت صرف جمعہ کے خطبوں کی حد تک رہ گئی تھی۔ روس کے نظام زار کی بساط الٹ چکی تھی۔ مشرق قریب میں شام و عرب کی خوں آشام سرزمین دوزخ کا نمونہ بنی ہوئی تھی اور برطانیہ اور فرانس کے تدبر نے اپنی عیاریوں سے عربوں اور شامیوں کی کمک سے ترکوں کو ان ممالک سے بے دخل کرنے کے بعد، فوقیت اور نفسانفسی کا راج قائم کر دیا تھا۔

غرض کہ اسلامی ممالک کا بظاہر کوئی مستقبل نہ تھا۔ مغرب کی سیاست نے مشرق کو ایسی زک دی تھی کہ صدیوں تک اس کا ابھرنا دوبھر نظر آتا تھا اور پان اسلامی تحریک، اور مشرق کی بیداری کا خواب محض سراب معلوم ہونے لگا۔

اس زبردست جھٹکے نے اور اقوام عالم کو بھی ایک طرح سے پریشان کر رکھا تھا۔ تجارت کی وہ گرم بازاری نہ رہی۔ عالمی کساد بازاری، بے روزگاری، افلاس اور فاقہ مستی کے مسائل نے دنیا کے مفکرین اور معاشیات کے ماہرین کی توجہ کو اپنی طرف جذب کیا۔ یہی مسائل ہندوستان کے سامنے بھی تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۲۱ء میں بڑی گرما گرمی کے ساتھ ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی جس کی باگیں مسٹر گاندھی کے ہاتھ میں آئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے اور ترک موالات اور خلافت کی تحریک ایک ساتھ چلنے لگی۔ علی برادران اور گاندھی جی کا اتحاد و تعاون اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں خوب رنگ لایا۔ لیکن اکبر جیسے اہل نظر پہلے ہی تاڑ گئے تھے کہ یہ دوستی دیر تک نبھنے والی نہیں۔ چنانچہ بعد میں جو واقعات درپیش ہوئے، ان سے اکبر کی دور نگاہی زبان زد خاص و عام ہوگئی۔ ہر عارف و عامی کی زبان پر یہ شعر تھا:

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گردِ راہ ہیں، مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اس عالم میں اقبال بیٹھے کیا کرتے تھے؟ بہتیروں کا خیال تھا کہ اقبال کی ''حجازی لے'' سرد ہوگئی۔ لیکن اس موقع پر بھی وہ چپکے نہ تھے۔ بھلا وہ کب چوکنے والے تھے؟ الگ تھلگ بیٹھے ایک نہ ایک پتے کی بات کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ جب خلافت کا وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان روانہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے مسلمانان ہند کی جانب سے ترکوں اور خلیفہ عثمانی کو آزاد کرنے کی اپیل کرے، تو اقبال نے اس کوشش کی بیہودگی پر زہرخند اگلا۔ چند اشعار کی ایک مختصر سی نظم تھی لیکن بڑی دور نگاہی کا پتہ دیتی تھی۔ عنوان تھا ''دریوزۂ خلافت'':

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی؟

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن ابھی تک کوئی طویل نظم ایسی نہیں پیش کی گئی تھی جس سے جنگ عظیم کے ان پریشان کن مسائل پر کافی روشنی پڑتی اور یہ معلوم ہوسکتا کہ ان حالات میں اقبال کے پیش نظر کس قسم کے منصوبے ہیں۔ آخر کار ۱۹۲۱ء کے یا ۱۹۲۲ء کے شروع میں وہ نظم شائع ہوئی جو حقیقت میں اسم بامسمیٰ ہے۔ ایک خضرِ طریقت کی طرح اپنی اس نظم (خضرِ راہ) میں اقبال نے ان تمام واقعات کا جائزہ لیا ہے جو اقوام عالم اور خصوصاً ایشیا والوں کی پریشانی کا باعث تھے۔ نظم کی ابتدا ایک گہرے اور پرسکون منظر سے ہوتی ہے۔ رات کا سناٹا ہے اور دریا کا کنارہ۔ زندگی کی چہل پہل چپ چاپ ہے۔ دریا کی موجیں ایک ضدی بچے کی طرح مچل مچل کر پانی کی گہرائیوں میں سوگئی ہیں۔ جبکہ چاروں طرف یوں سکوت چھایا ہے' تاروں کی چھاؤں میں خضر سے شاعر کی ملاقات ہوتی ہے۔ شاعر' خضر سے کچھ سوالات کرتا ہے۔ یہ وہی سوالات ہیں جو اوروں کی طرح اسے بھی پریشان کر رہے ہیں۔ خضر ان سب کا امید افزا جواب دیتا ہے۔ ان جوابات میں اقبال کا سارا رجائی فلسفہ جھلک رہا ہے۔

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا' ہوا آسودہ' دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے' یا تصویرِ آب؟
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیما' خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر' رنگِ شباب!
کہہ رہا ہے مجھ سے: ''اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب''

خضر کا اتنا اشارہ شاعر کے لئے ایک ''سوال بند'' بن جاتا ہے۔ وہ خضر سے پے در پے کئی ایک سوال کرتا ہے۔ وہ سوالات کیا ہیں؟ سنئے:

چھوڑ کر آبادیاں' رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے' بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں' اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
بیچتا ہے ہاشمی' ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے' اولادِ ابراہیم ہے' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ان پریشاں مسائل کے جو جوابات خضر نے دیئے ہیں ان سے خود اقبال کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ہر عنوان کے ذیل میں کئی ایک اشعار ہیں جو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ہر سرخی کے معنوی پہلو کو روشن کرتے ہیں اور ہر رنگ میں اقبال کی بے نظیر رجائیت نومیدوں کو امید دلاتی ہے۔ چاروں طرف مایوسی اور پریشانی کا عالم طاری ہے'

بڑے بڑے سیانے حواس باختہ ہیں۔مگر اقبال کے ماتھے پر شکن تک نہیں۔ پوری نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے غالباً ایک سال بعد مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ برطانوی فوجیں بری طرح قسطنطنیہ سے خارج ہوئیں۔اب کیا تھا ایک دھوم مچ گئی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفیٰ کمال پر پڑنے لگیں۔اقبال کے دل میں بھی امید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں۔ ''طلوع اسلام'' اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔لیکن یہ خوشی تادیر رہنے والی نہ تھی' اس لئے کہ بعد میں کمال نے جو روش اختیار کی' اس سے اقبال کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور اقبال نے پھر کبھی اس طرف کو مڑ کر بھی نہ دیکھا' گوتر کی اور ایران نے نئے سرے سے جنم لیا۔ افغانستان نے بھی امان اللہ خاں کی قیادت میں آہستہ آہستہ رضا اور کمال کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھان لی۔''عروق مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا۔'' لیکن ان ممالک کی مغرب زدہ چالیں اقبال کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہیں۔لہٰذا یہاں سے اپنے فلسفے کے اجتماعی پہلوؤں کو چھوڑ کر' انہوں نے خودی کی نوا کو تلخ تر کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ بےخودی کی تان ''خودی'' کے شور نشور میں گم ہوگئی۔ یہاں سے مسلسل کئی سال تک اقبال کی نوا' عجمی (فارسی) ہی رہی اور ۱۹۳۲ء یعنی جاوید نامہ کے شائع ہونے تک اردو زبان میں اقبال نے اپنا کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا؟ اردو کی جگہ فارسی نے لی۔

اقبال کی فارسی کا شباب ''طلوع اسلام'' کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اسرار اور رموز میں واعظانہ رنگ غالب ہے۔ فلسفہ زیادہ ہے اور شعریت کم۔ پیامِ مشرق کی اشاعت سے فلسفیت کم اور شعریت بڑھنے لگتی ہے اور نومشقی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔اسرار ورموز کی شراب سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

پیام مشرق چار حصوں میں تقسیم ہوئی ہے۔شروع کے ۸۰ صفحوں میں قطعہ نما رباعیاں ہیں جن میں لطف زبان کے ساتھ خودی کے وجد آفریں رموز بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں (جس کا عنوان ہے افکار) مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ان نظموں میں کچھ عنوانات بانگ درا کی نظموں کے عنوانوں سے ملتے جلتے ہیں۔(مثلاً افکار انجم' شبنم' لالہ' بوئے گل) لیکن یہاں ایک نئے انداز سے قدرت کے غوامض اور حسن بے پایاں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔فصل بہار' کشمیر اور ساقی نامہ میں اقبال کا رنگیں تخیل انتہائی زور کے ساتھ فارسی زبان میں پھول برسا رہا ہے۔بعض نظمیں خیال کی ندرت' زبان کی گھلاوٹ اور اسلوب کی جدت کے لحاظ سے فارسی ادب میں ایک انمول اضافہ ہیں۔ایران جدید کے بعض شعرا نے جو شیلے اور پرکیف گیت لکھے ہیں۔اقبال کی نوائے وقت کو بھی پڑھئے جو ایران جدید کے کئی ایک ترانوں پر بھاری ہے۔ پوری نظم ولولہ انگیز ہے۔خوف طوالت مانع ہے ورنہ یہاں نقل کرتا۔

حافظ کے ایک مشہور مصرعے کے ٹکڑے کا ایک ٹکڑا (بدہ ساقی مئے باقی) تیسرے حصے کا عنوان ہے۔حافظ کی مینا میں فلسفۂ خودی کی شراب عجب بہار دکھاتی ہے۔ بعد کو یہ پری رنگ چھان کر ایک نئے انداز سے زبور عجم میں نمودار ہوتی ہے۔

چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ہے ''نقش فرنگ'' جس میں مغرب کے بعض حکماء اور مشاہیر مثلاً نٹشے' برگسان' ہیگل' ٹالسٹائی' ہائنا' بائرن وغیرہ پر مزے کے تبصرے ہیں۔ پوری کتاب گوئٹے کے ''سلام مغرب'' کا جواب ہے۔

پیام مشرق کے غالباً دوسال بعد زبورِعجم شائع ہوئی جس میں اقبال نے اپنا سارا فلسفۂ حیات راگ اور نغمے کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ فردوسی کو بھی دعویٰ تھا کہ اس نے اپنی فارسی سے عجم کو زندہ کیا۔ مگر یہ دعویٰ قصے کہانی اور رزمیہ افسانہ نگاری کی حد تک درست تھا۔ اقبال نے حقائق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے اور صدیوں کی سوئی ہوئی قوموں کو اپنی حیات پرور نغموں سے زندگی اور بیداری کا پیغام سنایا ہے۔ یہ جانفزا ترانے غزل کے دلکش سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ راگ اور رنگ مشرق کی جان ہے اقبال اس راز کو خوب جانتے ہیں اور ایک ماہر نفسیات کی طرح مریض کی نفسیات کو پہچان کر حافظ کی مینا میں خودی کی شراب چھلکائی ہے۔ نتیجہ اس کا خاطر خواہ ہوا۔ زبان کے چٹخاروں پر جان دینے والوں نے جس خشک فلسفہ کو اسرار و رموز میں بہ جبر پڑھا تھا، اب زبورِ عجم کی پر کیف زبان میں انہیں مزے لے لے کر پڑھا۔

پوری کتاب چار حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ ۸۶ صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں ٦٦ نغمے ہیں۔ میں ان کو نغمے ہی کہوں گا اس لئے کہ گو ان کا ظاہری روپ غزل کا ہے مگر یہ غزلیں نہیں ہیں۔ ان نغموں میں بعض کی بحریں اور ردیف و قوافی، حافظ کی غزلوں کا کیف رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں مدہوشی نہیں۔ دو ایک نغمے مخمس، مثلث اور ترکیب بند کی شکل میں بھی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ نغمے سب کے سب پڑھے جائیں۔ محض ایک اندازے کی خاطر، چند اشعار یہاں پیش کروں گا۔ پہلا نغمہ ہی سنئے۔ دیکھئے لے غزل کی ہے، مگر غزل نہیں:

فصلِ بہار ایں چنیں، بانگِ ہزار ایں چنیں
چہرہ کُشا، غزل سرا، بادہ بیار، ایں چنیں
اشک چکیدہ ام ببیں، ہم بہ نگاہ خود نگر
ریز بہ نیستانِ من، برق و شرار، ایں چنیں
باد بہار را بگو، پے بہ خیال من برد
وادی و دشت را دہد، نقش و نگار ایں چنیں
عالمِ آب و خاک را، بر محک دلم بسائے
روشن و تار خویش را، گیر عیار، ایں چنیں
دل بہ کسے نہ باختہ، باد و جہاں نہ ساختہ
من بہ حضور می رسم، روزِ شمار ایں چنیں

ذرا اس دل کی بھی بہار دیکھئے، مگر یہ ہمارے ہاں کے عشاق کا دل نہیں، یہ دل ایک مردِ خود آگاہ کا دل ہے:

بدہ آں دل کہ مستی ہائے اواز بادۂ خویش است
بگیر ایں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است
بدہ آں دل، بدہ آں دل، کہ گیتی را فرا گیرد
بگیر ایں دل، بگیر ایں دل کہ در بندکم و بیش است
مرا اے صید گیر! از ترکش تقدیر بیروں کش
جگر دوزی چہ می آید از آں تیرے کہ در کیش است
نہ کردد زندگانی خستہ از کار جہاں گیری
جہانے درگرہ بستم، جہان دیگرے، پیش است

ایک آخری مثال۔ اشعار کیا ہیں سرود حیات۔ رمز اور اشارے میں کیسے پتے کی باتیں کہہ دی ہیں:

چند بروئے خودکشی، پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا، تمام کن، جلوۂ ناتمام را
من بہ سرودِ زندگی، آتش او فزودہ ام
تو نم شبنمے بدہ، لالۂ تشنہ کام را
عقل ورق ورق بہ گشت عشق بہ نکتۂ رسید
طائر زیرکے برد، دانۂ زیر دام را

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را
وقتِ برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو، کجا برم ہم نفسانِ خام را

دوسرا حصہ پہلے حصے سے کچھ کم جاذب توجہ نہیں۔ اس حصے کی منظوم سرخی ہی وہ معنویت رکھتی ہے کہ اس میں اقبال کا سارا فلسفہ سمٹ سمٹا کر بیت الغزل بن گیا ہے۔ شعر ہے:

شاخ نہال سدرۂ، خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شدی، منکر خویشتن مشو

اقبال خودی کا یہ پرچار بار بار کیوں کرتے ہیں؟ اس کا سبب کچھ انہیں کے پرکیف الفاظ میں سنئے:

چو موج مست خودی باش و سر بہ طوفاں کش
ترا کہ گفت کہ نخشیں و پابہ داماں کش؟
بہ قصد صید پلنگ، از چمن سرا برخیز!
بہ کوہ رخت کشا، خیمہ در بیاباں کش
بہ مہر و ماہ کمند گلو فشار انداز
ستارہ را زفلک گیر و در گریباں کش
گرفتم ایں کہ شراب خودی بسے تلخ است
بہ درد خویش نگر، زہرما بہ درماں کش

تناسب کا احساس مجھے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ پوری زبور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس حصے کے صرف ایک نغمے کو یہاں جگہ دی گئی ہے۔ پڑھنے والے کے ذوق خودی کو بیدار کرنے اور اس کے خون میں گرمی پیدا کرنے کے لئے ایسے ۸۴ نغمے اور ہیں۔ البتہ حصہ اول و دوم کے ترجیع بند ۱۹، ۱۸ اور ۳۰ بڑے جوشیلے اور اثر آفریں نغمے یا ترانے ہیں۔ ان ترانوں کے ترجیعی مصرعوں کے ٹکڑے ہیں: (۱) ''انقلاب اے انقلاب'' اور (۲) ''از خواب گراں خیز''۔

تیسرے حصے کا عنوان ہے: گلشنِ رازِ جدید جس میں نو منظوم سوالوں کے بطرز مثنوی مفصل جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ سوال اور ان کے جوابات چند فلسفیانہ موشگافیوں سے متعلق ہیں جو عام دلچسپی کا سامان نہیں رکھتے۔ چوتھے حصے کا عنوان ہے بندگی نامہ جس میں بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری پر اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو بعضوں کے نزدیک درست اور بہتوں کے نزدیک بحث ونزاع کا موضوع ہیں۔ لیکن ہر جگہ شاعر کی جادو بیانی پڑھنے والوں کی زبان بندی کر دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پہلے دو حصے زبور کی جان ہیں۔

زبور عجم کی اشاعت کے دو ایک سال بعد ہی اقبال نے اپنی اس لازوال تصنیف کے تانے بانے درست کرنے شروع کئے جس نے اقبال کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اس سے میری مراد ہے جاوید نامہ جو اقبال کے شاعرانہ کمال کا بہترین نمونہ اور اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ اب تک جو کچھ اقبال نے کہا اور کسی سطح سے کہا تھا، لیکن یہاں جو کچھ کہا ہے ایسے بلند مقام سے کہا ہے جہاں الہام اور شعر، عرفان اور ادبیات عالیہ کی حدیں ملتی ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است
ایں کتاب از آسمانے دیگر است

آسکر وائیلڈ کا قول ہے کہ ''فنکار کا عمل، اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے۔'' جاوید نامہ اقبال کی یگانہ سرشت کا وہ بے مثل ثمر ہے جس کی مثال خود اقبال کے کلام میں اور کہیں نہیں ملتی۔ مسلسل تین سال تک اس کتاب کی تخلیق میں اقبال نے اپنی

توانائی بے دریغ صرف کی، جب کہیں یہ انمول موتی عدم سے وجود میں آیا۔ ۱۹۲۹ء میں جبکہ اقبال مدارس اور بنگلور میں اپنے خطابات سنا کر حیدر آباد آئے تھے، اس زمانے میں اس کتاب کے کچھ دھندلے نقوش ان کے ذہن میں تھے۔ اس موقع پر جب میں نے ان کو دیکھا تو ایک خاص تفکر اور پریشانی کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں تھے۔ یہ وہ آثار تھے جو کسی شاہکار کی تخلیق سے پہلے کسی فن کار کے چہرے سے ''غم پنہاں'' کی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ فکرمند اور کھوئے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی انتہائی سوچ میں کسی چیز کی تلاش یا دھن میں ہو..... بعینہٖ وہ دھن اور فکرمندی جو کسی اعلیٰ تخلیق کاری کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس انوکھی فکرمندی کا گل اس وقت کھلا جب ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ شائع ہوا۔

ملٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی ''گم شدہ فردوس'' اس کی تمام زندگی کا حاصل اور اس کے شاعرانہ کمال کا نچوڑ ہے۔ اپنی ساری توانائی اس نے اس کتاب پر صرف کر دی، جب کہیں اس لازوال کتاب کے نقوش اس کے علم سے نغمے اور شعر کے پیکر میں ظاہر ہوئے۔ بعد کو اور بھی چیزیں اس کے قلم سے نکلیں لیکن یہ بات کسی میں نہ آئی۔ یہ مثل اقبال کے جاوید نامہ پر بھی صادق آتی ہے جس کی تیاری میں اس نے اپنا خونِ حیات پانی کی طرح بہا دیا۔ بعد کو دو مجموعے اردو کے اور ایک مجموعہ فارسی کا بھی نکلا۔ اردو کے پرستاروں کی جان میں جان آئی کہ اقبال نے پھر اردو کی طرف توجہ کی۔ لیکن میری رائے میں یہ دونوں کتابیں ایک تھکے ہوئے نقش کار کے وہ نقوش ہیں جو اس نے بائیں ہاتھ سے گھسیٹے ہیں۔ مانا کہ ان نقوش میں وہ کمال ہے جو بہتیرے باکمالوں کے داہنے ہاتھ کی تخلیق کاریوں میں نہیں، پھر بھی جاوید نامے کے آگے ضرب کلیم اور بالِ جبریل گھٹیا درجے کی چیزیں ہیں۔ مولانا اسلم جیراج پوری، جاوید نامے کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستان سعدی اور دیوان حافظ۔ لیکن اب جاوید نامے کو پانچویں کتاب سمجھنا چاہئے، جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانان عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے۔

شکر کا مقام ہے کہ یہ کتاب نصاب میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ لوگ شوق سے اپنے طور پر اس کو پڑھیں۔ جبراً پڑھانے اور شامل نصاب کرنے میں ایک شاہکار کا حسن مارا جاتا ہے اور وہی مثل صادق آتی ہے کہ ''شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد''؟

ایک بلند پایہ تصنیف کی حیثیت سے یہ کتاب یوں بھی تفصیلی تنقید سے بے نیاز ہے۔ میں خود بھی اس جوشِ تنقید اور زور ہمہ دانی کو برا سمجھتا ہوں جبکہ ایک برخود غلط تنقید نگار کسی اچھی کتاب کا سب رس نکالنے کی کوشش میں اسے بے رس بنا دیتا ہے۔ آرٹ وہی ہے جو تنقید و تحریف کی حدوں میں نہ آئے۔ اس لئے میں صرف ایسے امور پر اکتفا کروں گا جن سے اس کتاب کو اپنے طور پر پڑھ کر محظوظ ہونے میں آپ کو آسانی ہو۔

ساری کتاب رنگین تخیل، شاعرانہ پرواز نظر اور فلسفیانہ بلند نگاہی کے ساتھ، ادبی اور فن کارانہ لطافتوں سے مالا مال ہے۔

زبان میں پختگی کے علاوہ بلا کی مٹھاس ہے۔ کتاب کا سارا انداز مثنوی میں ہے لیکن جا بجا پر کیف نغمے بھی غزل کے سانچے میں پیش کئے گئے ہیں جن میں بلا کا ترنم اور شعریت ہے۔ ان میں سے بعض نغمے تو وہی ہیں جو زبورِ عجم سے لے کر یہاں پر مناسب موقع پر شامل کر دیئے گئے ہیں۔ غزلوں کا یہ جڑاؤ کام عجب بہار دکھاتا ہے۔

کتاب کے شروع میں شاعر کا منظوم دیباچہ ہے جس سے اس نظم جاوید کا معنوی پہلو چار مصرعوں میں آئینہ ہو جاتا ہے:

خیال من بہ تماشائے آسماں بود است
بدوش ماہ و بہ آغوش کہکشاں بود است
گماں مبر کہ ہمیں خاک داں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

شکوہ اور جواب شکوہ میں بھی اقبال ہنگامۂ زمین سے دور، آسمانوں کے اس پار گئے تھے۔ لیکن یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ یہ فن کارانہ بلندی انہیں نصیب نہ ہوئی تھی۔ صرف زبانی جمع خرچ تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ پورے اہتمام اور فن کارانہ تفصیل کے ساتھ مختلف افلاک کی سیر کرتے ہیں اور اس طرح نوبت بہ نوبت اور منزل بہ منزل فراز آسمان کا رخ کرتے ہیں اور اپنے عرفانی مدارج کا ہر زینہ الفاظ کے نقوش سے اس طرح روشن کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی ساتھ ہی ساتھ اس نئی دنیا کو دیکھنے کے شوق میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اگر مطلوب ہو تو دیباچے کے علاوہ ''مناجات'' (جس سے کتاب دراصل شروع ہوتی ہے) تمہید آسمانی، تمہید زمینی کو بغور پڑھئے جن کے ذریعے شاعر نے مختلف دلپذیر طریقوں سے واقعیت کا طلسم باندھا ہے۔ مناجات کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ اس ''جہان ہفت رنگ'' میں انسان کو سدا درد آشنا رفیق کی تلاش رہتی ہے کہ اس سے اپنے دل کا ماجرا بیان کرے۔ لیکن وہ ناکام ہی رہتا ہے اس لئے کہ ان مٹی کے پتلوں سے دل دہی کی امید رکھنا ہی عبث ہے، خصوصاً اس دور میں کہ انسان دور بیں ہے مگر بصیرت نہیں رکھتا۔

غرض کہ نہایت دل آویز طریقوں اور نازک تشبیہوں اور اشاروں سے بارگاہِ ایزدی میں یہ التجا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ شاعر کے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی پذیرائی کا پڑھنے والے کو بھی یقین سا ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد تمہید آسمانی میں زمین کی بے رونقی پر آسمان کا زہر اگلنا، پھر جناب باری میں زمین کی درد بھری فریاد اور رحمت باری کا جوش میں آکر خاک دان ہستی کو شاداب اور نہال کرنے کا وعدہ اور پھر ندائے غیبی کے بعد نغمۂ ملائک کی امید افزا بشارت، یہ سب چیزیں اس کمال اور فن کارانہ اہتمام کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جبکہ اقبال کو وہ معراج عرفان حاصل ہو جائے جس کے وہ آرزومند ہیں۔ نغمۂ ملائک کے اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد بھی ان کی یہ بہار ہے، تو اپنی جگہ پر کیا عالم ہوگا۔ سارے اشعار ترنم اور رجائیت میں شرابور ہیں:

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ اُو گردوں شود روزے
خیالِ او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
زگرداب سپہرِ نیل گوں، بیروں شود روزے
یکے در معنیٔ آدم نگر، ازما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر اوُ پرخوں شود روزے

(تمہیدآسمانی۔جاویدنامہ)

نغمۂ ملائک ابھی کانوں میں گونج ہی رہا ہوتا ہے کہ شام کی شعریت سے لبریز سناٹے میں شاعرؔ مولانا روم کی ایک مستانہ غزل دریا کے کنارے گنگناتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اشعار کے الفاظ بھی بڑے برمحل اور ذومعنیٰ ہیں۔ان پہلودار الفاظ اور تشبیہوں کی آڑ میں ایک جگہ اقبال نے اپنے زمانے کے ''دیوودؔ'' اور ان کی فرعونیت پر پیمبرانہ لہجے میں برہمی کا اظہار کیا ہے۔یہ چیز ضربِ کلیم میں اور بھی نمایاں ہوگئی ہے' جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔چنانچہ چند اشعار تمہیدِ زمینی کے پیش کرتا ہوں۔ضربِ کلیم کا حوالہ بطور جملہ معترضہ کے تھا۔

بکشائے لب کہ قند فرا وانم آرزو است
بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزو است
یک دست جام بادہ و یک دست زلفِ یار
رقص چنیں میانۂ میدانم آرزو است
جانم ملول گشت زفرعون و ظلم او
آں نو حبیب موسیٰ عمرانم آرزو است
زیں ہمرہان سست عناصرؔ دلم گرفت
شیرِ خدا و رستم دستانم آرزو است

(تمہیدزمینی۔جاویدنامہ)

شعرخوانی کا سلسلہ ختم ہونے پر' شعریت اور سکون سے اس لبریز ماحول میں دریا کے کنارے کچھ دور ایک پیکرِ نور' پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے۔یہ وہی خضرِ طریقت ہے جس کے غائبانہ فیض نے اقبال سے اسرار و رموز لکھوایا تھا۔یہاں سے بے محابہ سوالوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے اور پیر روم اقبال کے ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیتے ہیں۔پھر معراج کے اسرار سے باخبر کرتے ہیں۔معراج کیا ہے؟ شعور کامل جس کے تین مدارج ہیں (۱) شعور ذات (۲) شعور غیر (۳) شعور حق تعالیٰ۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
چیست معراج؟ آرزوئے شاہدے
امتحانے روبرئے شاہدے
پیکر فرسودہ را دیگر تراش
امتحان خویش کن موجودہ باش

☆☆☆

تو ازیں ُنہ آسماں ترسی؟ مترس
از فراخائے جہاں ترسی؟ مترس
چشم بکشا' بر زمان و بر مکاں
ایں دو یک حال است از احوالِ جاں
چیست تن؟ بارنگ و بو خوکردن است
بامقامِ چار سو خوکردن است
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعورؔ از جذب و شوق
وارہاند جذب و شوق از تحت و فوق
ایں بدن با جانِ ما انبار نیست
مشت خاکے مانع پرواز نیست

رومی کے ان الفاظ سے شاعر اپنے میں ایک غیر معمولی توانائی محسوس کرنے لگتا ہے۔ زمان و مکان کی طنابیں کھنچنے لگتی ہیں اور رومی کی معیت میں شاعر عالم علوی کی سیر کرتا ہے جہاں زرواں (روح زمان و مکان) سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ اس کے بعد رہا سہا حجاب بھی دور ہو جاتا ہے۔ زرواں کی نگاہوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ شاعر خود کو عالمِ افلاک کی طرف اُڑتا ہوا پاتا ہے۔ یہ کیفیت کیسے طاری ہوئی؟ اس کا لطف کچھ شاعر ہی کی زبان سے آئے گا:

در نگاہے او نمی دانم چہ بود
از نگاہم ایں کہن عالم ربود
یا نگاہم بردگر عالم کشود
یا دگرگوں شد ہمیں عالم کہ بود
مُردم اندر کائنات رنگ و بو
زادم اندر عالم بے ہائے و ہو
تن سبک تر گشت و جاں سیار تر
چشمِ دل بیندہ و بیدار تر

اب کیا تھا بے پر کے اڑنے لگے۔ مختلف سیاروں کی خبر لی۔ پہلے فلک قمر پر پہنچے اور اس کے بعد دوسرے سیاروں کا جائزہ لیا۔ ہر جگہ اقبال کے جبریل امین ساتھ ہیں۔ اب یہاں سے اپنے طور پر معراج اقبال کا کمال دیکھئے۔ آگے کیا بیان کیجئے کہ تنقید کے پر جلتے ہیں۔ مزہ جب ہی ہے کہ نشان منزل تھوڑا بہت بتانے کے بعد، پڑھنے والا خود پڑھے اگر سچ مچ لطف اٹھانا چاہتا ہے۔

کتاب کے خاتمے پر بطور ضمیمہ کچھ اشعار ہیں جن میں اقبال کے فرزند جاوید سے خطاب ہے۔ اصل میں یہ خطاب ساری نئی پود سے ہے۔ نوجوانوں ہی سے اقبال کو بجا طور پر امیدیں ہیں۔ بڈھے تو بے موسم کے پھل ہیں:

من کہ نو میدم ز پیرانِ کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرشاں پایاب کن ژرفِ مرا

(مناجات۔ جاوید نامہ)

وہی ''تنگنائے غزل'' جس کے غالب کبھی شاکی تھے، اقبال نے اس میں اب ''بقدر شوق'' وسعت پیدا کر لی ہے اور اس کے اندر سارا فلسفۂ خودی اور حالات حاضرہ سے متعلق اقبال کے تمام تاثرات موجیں مارتے ہیں۔ گویا ''سمندر ہے اک بوند پانی میں بند'' اس شاعرانہ اعجاز کا نمونہ وہ کتاب ہے جو جاوید نامے کی اشاعت سے تین سال بعد (۱۹۳۵ء) بال جبریل کے عنوان سے شائع ہوئی۔ کتاب کا نصف سے زائد حصہ زبور کا چربہ ہے اور وہی باتیں بالفاظ دیگر دہرائی گئی ہیں۔ خبر نہیں اقبال نے اس کا نام بال جبریل کیوں رکھا۔ زبور ہند بہتر نام ہوتا۔ ممکن ہے کہ جاوید نامہ میں سیر افلاک کرنے کے بعد بھی اس دنیا کے طلسمی مناظر دماغ میں گھوم رہے تھے جس کی بنا پر اقبال نے غالباً اس نام کو زیادہ موزوں پایا۔

جن پر فارسی کے دروازے بند ہیں، انہیں بال جبریل پر قناعت کرنی چاہئے۔ پیامِ مشرق، زبور عجم اور جاوید نامے پر انتہائی زور اور شاعرانہ توانائی صرف کرنے کے بعد اقبال نے اردو کا رخ کیا۔ گو وہ تنوع جو پیام مشرق میں ہے، یا وہ تغزل اور برجستگی جو زبور میں ہے، یا وہ فن کارانہ اہتمام اور وہ بیداریٔ تخیل جو جاوید نامے میں ہے، اس کتاب میں نہیں، تاہم ایک بیکراں دماغ کی پیداوار ہونے

کی حیثیت سے بے کراں چیز ہے اور محض اردو داں حضرات کے لئے جو فارسی کے ''نقشہائے رنگ رنگ سے بے بہرہ ہیں' بال جبریل' زبور عجم اور جاوید نامے' کا بدل ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ زبور کے ابدی نغموں کی صدائے بازگشت ہے۔ جس طرح زبور میں شراب خودی حافظ کی مینا میں پیش کی گئی ہے' بال جبریل میں وہی شراب داغ اور غالب کے گنگا جمنی ساغر میں چھلکائی گئی ہے۔ بظاہر وہی کیف شیرازان غزل نما نغموں میں بھی دکھائی دیتا ہے' لیکن یہ کچھ اور چیز بلکہ اقبال کی اپنی چیز ہے۔ فارسی سے برسوں شغف رہنے کے باعث' زبان بانگ درا سے بہتر اور منجھی ہوئی ہے۔ اسلوب میں پختگی ہے اور بندشیں چست ہیں' مگر کہیں کہیں فارسی کی نامانوس ترکیبیں بھی آ گئی ہیں۔

دوسرا حصہ مختلف موضوعوں پر مشتمل ہے۔ کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارتوں اور مقامات پر ہیں جن سے ہر مسلمان کے جذبات اب تک وابستہ ہیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اقبال جب یورپ گئے تھے تو ہسپانیہ کے ان شہروں کا جو کسی زمانے میں اسلامی تہذیب و شائستگی کا گہوارہ تھے' نجی طور پر دورہ کیا تھا۔ مسجد قرطبہ اور دوسرے عنوانوں کی نظمیں جو ہسپانیہ سے متعلق ہیں' انہی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ایک نظم جس کا عنوان ہے ''ذوق و شوق'' فلسطین میں لکھی گئی تھی۔ خاصی اچھی اور پرترنم نظم ہے اور ابتدا میں مناظر قدرت کی موکشی اقبال کے حُسن کارانہ کمال کا پتہ دیتی ہے' جس کے بیشتر نمونے بانگ درا میں بھی جا بجا موجود ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ اور بھی چھوٹی بڑی نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں۔ لیکن ساقی نامہ بہترین نظم ہے۔ بہار کا منظر اور قدرت کے پر بہار بیل بوٹے بڑی چابک دستی سے کھینچے گئے ہیں۔ بعد کے بندوں میں حالات حاضرہ کے بعض اہم مسائل پر کوثر کی دھلی ہوئی زبان میں تبصرے ہیں۔ پوری نظم مثنوی سحر البیان کی طرز پر اور اسی بحر میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اقبال کا سحرِ بیان کچھ اور ہے۔ جن کی نظریں محض لطف زبان پر ہوں' انہیں اتنا دھوکہ ضرور ہوگا کہ اقبال کے پیکر میں میر حسن نے جنم تو نہیں لیا؟ یہ چند اشعار دیکھئے۔ دور حاضر کے خشک اور الجھے ہوئے مسائل کو لیا ہے' لیکن کتنی سلجھی ہوئی زبان اور نکھری تشبیہوں میں بیان کیا ہے۔ شروع میں رسمی طور پر ساقی سے خطاب ہے مگر یہ ساقی کوہِ فاران کا ساقی ہے:

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے
زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے' ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے!
دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!

☆☆☆

شراب کہن پھر پلا ساقیا!
وہی جام گردش میں لا ساقیا!
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خودی کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری!
امیدیں مری، جستجوئیں مری!
مرا دل مری رزمگاہِ حیات!
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

ایک سال کے اندر باہر ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) بھی شائع ہوئی جس میں دورِ حاضر کی فرعونیت کے خلاف کھلا ''الٹی میٹم'' (اعلان جنگ) ہے۔ کتاب کا عنوان وجہ تسمیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں سے اقبال کی نوا میں زوال کے آثار صاف نمایاں ہیں۔ یہی حال ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کا بھی ہے۔ ہر کمالے راز والے۔ آخر کہاں تک انسانی دماغ کام کرتا؟ دانتے کے بارے میں مشہور ہے کہ ''آسمانی طربیہ'' کے لازوال نغموں کے بعد اس کی صحت نے جواب دینا شروع کیا۔ یہی حال اقبال کا ہوا۔ جاوید نامے نے انہیں زندہ جاوید کیا اور مارا بھی۔ دنیا کے اور صاحب کمالوں کی طرح وہ سخت جان تھے۔ استقلال اور ہمت نے جاوید نامے کے جاں گسل بار کے باوجود؛ بال جبریل کے اوراق ان سے مرتب کرائے۔ لیکن بالِ جبریل کی اشاعت ان کے حق میں موت کا پیش خیمہ تھی۔ کوئی تین سال اور جیے۔ لیکن کس طرح کہ دمے کی تکلیف سے ان کی جان ضیق میں تھی۔ اس پر بھی دو کتابیں لکھ ہی ڈالیں۔ دونوں (ضرب کلیم اور پس چہ باید کرد) کتابوں میں اقبال ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح جو گولی کھا کر بھی اپنے دشمن پر جست کرتا ہو؛ موجودہ دور کی ناانصافیوں کے خلاف گرج رہے ہیں۔ دونوں کتابوں کا لہجہ وہ جلالی شان رکھتا ہے جیسے بنی اسرائیل کا کوئی نبی اپنی گمراہ قوم کو راہِ راست پر لانے کے لئے کڑک رہا ہو۔

اقبال ایک بڑا شاعر تھا اور اس کا پیغام ایک عالمگیر اپیل رکھتا ہے۔ اس کا نام تاریخ کے اوراق میں سدا جگمگاتا اور سینوں اور دلوں میں جگنو کی طرح چمکتا رہے گا۔ وہ چل بسا، مگر اس کا پیام اٹل ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

****

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وزیر محمد جعفر

سنگسار

روایات اور قرآن کے آئینہ میں

چند ماہ قبل کوہاٹ میں عدالت نے ایک عورت کو حدود کیس میں سنگسار کرنے کی سزا سنائی۔ جس کے بعد ملک کے طول وعرض میں انسانی حقوق کی تنظیمیں خصوصاً خواتین کی این جی اوز سراپا احتجاج بن گئیں جبکہ علماء نے اس سزا کو عین اسلامی سزا قرار دیا اور اس سزا کو قرآن سے ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ جون ۲۰۰۲ء کے پہلے ہفتہ میں وفاقی شرعی عدالت نے مذکورہ عورت کی سزا کو معطل کر کے باعزت بری کر دیا۔

قارئین آیئے ہم دیکھیں کہ زمانہ قدیم میں کسی شخص کو سنگسار کب کیا جاتا تھا؟ سورہ ھود میں حضرت شعیبؑ کی قوم انہیں کہتی ہے کہ ''اے شعیبؑ اگر تیرے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو تجھے سنگسار کر دیتے''۔ (سورہ ھود' آیت نمبر ۹۱)۔

بائبل مقدس کتاب احبار باب نمبر ۲۰' درس نمبر ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ ''جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیئے جائیں''۔

درج بالا قرآنی آیت اور بائبل کے دروس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اگر کسی کو جان سے مار دینا ہوتا تو وہ اسے سنگسار کر کے مار دیتے تھے۔ اس وقت یہی طریقہ رائج تھا۔ اب آیئے دیکھیں کہ زنا کی سزا کے بارے میں قرآن کریم فرقان حمید میں کونسی سزا متعین کی گئی ہے۔ زنا کی سزا کے سلسلے میں قرآن حکیم سے بنص صریح ثابت ہے کہ ہر زانی کو سو کوڑے مارے جائیں۔ ارشاد ربانی ہے۔ ''زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو'' (سورہ نور آیت نمبر ۲)۔

یہاں کسی قسم کی تخصیص نہیں کی گئی بلکہ ہر زنا کے مرتکب کی یہ سزا بتائی گئی ہے چاہے وہ شادی شدہ ہو یا کنوارا۔ مگر روایت پرست کہتے ہیں کہ قرآن کا حکم صرف کنواروں کے لئے ہے' شادی شدہ کی سزا سنگسار کرتا ہے۔ مگر قرآن کسی کی باطل تاویلات کے لئے گنجائش کہاں چھوڑتا ہے؟ سورہ نساء میں فرمایا۔

''پھر جب لونڈیاں نکاح میں لائی جائیں تو اگر وہ زنا کا ارتکاب کریں تو ان کے لئے آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی (نصف) سزا ہے۔'' (سورہ نساء آیت نمبر ۲۵)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لونڈیاں اگر شادی شدہ ہوں اور زنا کی مرتکب ہوں تو انہیں آزاد شادی شدہ عورتوں سے نصف سزا دی جائے سو کوڑوں کا نصف تو پچاس کوڑے ہوئے مگر رجم (سنگسار) کا نصف کیا ہوگا؟ کیا روایت پرست علماء تشریح کر سکتے ہیں؟

رجم (سنگسار) کرنے کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے۔ ''الشیخ والشیختہ اذا زنیا فارجموھا الخ'' اس کے معنی کئے جاتے ہیں۔ ''شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اگر زنا کے مرتکب ہوں تو دونوں کو سنگسار کیا جائے''

عربی کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ شیخ کے معنیٰ شادی شدہ ہونا' دنیا کی کسی لغت میں نہیں عربی میں تو پچاس سال سے اوپر کے آدمی کو شیخ کہتے ہیں قرآن بھی شیخ کا لفظ بہت بوڑھے اور ازکار رفتہ آدمی کے لئے استعمال کرتا ہے دیکھئے جب ابراہیمؑ کی بیوی کو حضرت اسحٰقؑ کی بشارت ملتی ہے تو وہ حیران ہو کر کہتی ہیں۔

ء الدوانا عجوز وھذا بعلی شیخا ان ھذا لشیء عجیب o

ترجمہ۔ ''میں جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔'' (سورہ ھود آیت نمبر ۷۲)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''شیخ'' اس عمر کے آدمی کو کہتے ہیں جس سے توالد و تناسل سے بظاہر ناامیدی ہو نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بوڑھی عورت کے لئے الشیختہ نہیں بلکہ ''عجوز'' استعمال ہوتا ہے۔ الشیختہ قطعی غیر فصیح لفظ ہے جو لوگ اسے قرآن کریم کی آیت قرار دیتے ہیں وہ سوچیں تو سہی کہ کیا قرآن شادی شدہ جوڑے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے جس سے عربی دان طبقہ واقف نہ ہو اور پھر حضرت عمرؓ پر یہ کتنا بڑا الزام ہے کہ وہ شیخ کو شادی شدہ کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں دنیا بھر کے روایت پرستوں کو چیلنج ہے کہ کسی لغت میں شیخ کا وہ مفہوم دکھا دیں جو یہ لوگ لیا کرتے ہیں۔

ان روایت پرست علماء سے پوچھ لیجئے کہ جو شخص قرآن میں کمی بیشی مانے اس کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟ بلکہ میں خود علماء سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ قرآن میں تحریف کے قائل نہیں؟ اللہ گواہ بنا کر کہئے کہ کیا آپ کا یہی عقیدہ نہیں؟ کیا میں نے کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب کی ہے؟ ہمارے علماء کہتے ہیں یہ آیت تلاوت میں تو منسوخ ہو چکی ہے مگر اس کا حکم باقی ہے۔ درس نظامی میں نور الانوار ابتدائی کتاب ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ آیۂ رجم (سنگسار) قرآن کی آیت تھی وہ تلاوت میں منسوخ ہو گئی یعنی قرآن سے خارج کر دی گئی مگر اس کا حکم باقی ہے۔ حنفی علماء یہی کتاب پڑھتے ہیں اور اسی بات پر ان کا ایمان ہے کہ یہ آیت قرآن سے حذف ہو گئی اور ہاں کیا آپ اس بات کی کوئی صحیح تاویل پیش کر سکتے ہیں کہ جس آیت کا حکم باقی ہو اسے تلاوت میں منسوخ کرنے میں کیا مصلحت ہے؟

یہ روایت اور اس طرح کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روایات دین اسلام کا جزو کیسے بن گئیں؟ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت علیؓ

زیادہ فتوحات کے مخالف تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو علاقے فتح ہو چکے ہیں وہاں کے نومسلموں کی اچھی طرح تربیت کی جائے تاکہ وہ دین اسلام کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور اسلامی معاشرہ کے موثر رکن ثابت ہوں لیکن ان کی باتوں پر عمل نہ کیا گیا۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ ملک گیری اور زیادہ مال غنیمت حاصل کرنے کی لالچ نے اسلامی تعلیمات کو بہتر طور پر نومسلموں تک نہ پہنچنے دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان نومسلموں نے کلمہ اسلام تو پڑھ لیا لیکن ان کے عقائد سابقہ مذاہب کے مطابق ہی رہے۔ اس لئے انہوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنے سابقہ مذاہب کے مطابق ڈھال لیا اور ایسی ایسی بے سروپا روایات اور احادیث نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دی گئیں جن کا دین اسلام کی تعلیمات سے دور تک کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ان ہی روایات کو اصل الاصول اور عین دین سمجھ لیا گیا ہے۔ جبکہ قرآن کریم میں اللہ کے بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ۔

''جب ان کے سامنے اللہ کی آیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ اس پر بہرے اور اندھے ہو کر گر نہیں پڑتے بلکہ غور و فکر کر کے ان پر ایمان لاتے ہیں''۔ (سورہ فرقان آیت نمبر ۷۳)۔

ہم نے قرآن کریم فرقان حمید پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے اور بے سروپا ضعیف روایات کو دین مان کر۔ ان پر عمل پیرا ہیں اسی لئے رسول اکرمؐ روز قیامت یہ گلہ کریں گے۔

''اے میرے رب بے شک میری قوم نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا''۔

اسی لئے ہمیں ان روایات و احادیث پر ایمان رکھنا چاہئے اور عمل پیرا ہونا چاہئے جو قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہوں اور جو روایات و احادیث قرآنی تعلیمات کے منافی ہوں تو ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نبی اکرمؐ کے اقوال نہیں ہو سکتے۔

والسلام علی من اتبع الھدی (۲۰/۴۷)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

جمعۃ المبارک کا اجتماع الصلوٰۃ

جمعۃ المبارک کا روز ہے۔ محلّہ کے مسلمان اپنی اپنے طور پر اس کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ مساجد کی صفیں اور دریاں درست کی جا رہی ہیں۔ کوئی اپنے لباس کو ٹھیک کر رہا ہے تو کوئی اپنے جوتوں کی لشک پشک میں لگا ہوا ہے۔ غسل تو اس روز ترجیحات اول میں شامل ہوتا ہے اور اگر مل جائے تو اچھی خوشبو بھی سنت رسولؐ میں شامل ہو جاتی ہے۔ ادھر اذان ہوئی ادھر نمازی حضرات بھی بحکم خداوندی جوق در جوق مساجد میں آنے لگ گئے کیوں نہ ہو جمعہ کی نماز اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے اور ثواب حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے اور ثواب کیا ہے۔ یہ انسانی اعمال کا وہ نتیجہ ہے جو محسوس شکل میں اس دنیا میں ملتا ہے اور آخرت میں بھی ملے گا۔ البتہ ہمارے ہاں ایصال ثواب کا جو عقیدہ رائج ہے قرآن سے اس کی سند نہیں ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس عقیدہ کو اسلام میں زبردستی داخل کر لیا گیا ہے۔ خطبہ شروع ہوتا ہے تو نہ قرآن کا ذکر اور نہ اس کے نفاذ کی بات۔ سارا وقت روایات اور ان کی تشریح میں گزر جاتا ہے اور یہ دو چار دن کی بات نہیں ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے یوں ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ بقول شاعر۔

ہے شوق سفر ایسا کہ اک عمر سے یاروں نے
منزل بھی نہیں پائی رستہ بھی نہیں بدلا

یہی ہے زندگی کا جمود اور تقلید کی راہ جو انسان کو حیوانوں کی سطح تک پہنچا دیتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اس خود ساختہ مذہب میں لوگوں کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے جانوروں کا ریوڑ۔ جس میں ماسوا چرواہے کی بے معنی آوازوں کے اور کچھ سننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ بہرے۔ اندھے اور گونگوں کا یہ ہجوم جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتا۔'' (۲/۱۷۱) حیف اور صد حیف کہ ہمارے علمائے کرام میں علامہ بھی ہیں اور مولانا بھی لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ اس عظیم اجتماع میں کیوں آئے تھے اور کیا لے کر جا رہے ہیں۔ اس کی حکمت کیا ہے۔ اس کے مقاصد اور غرض و غایت کیا ہے اور قوانین خداوندی سے ہم ملی اجتماع الصلوٰۃ کے لئے اپنی راہنمائی کے لئے کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہیں تورات دی گئی۔ لیکن انہوں نے اس کی عائد کردہ پابندیاں بھلا دیں اور ان پر عمل نہ کیا۔ ان کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی گدھے پر بڑی بڑی کتابیں لاد دی جائیں اور وہ انہیں اٹھائے پھرے۔ ظاہر ہے اس سے اس گدھے کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہی مثال اس قوم کی ہے۔ جو قوانین خداوندی کی

صداقت کا زبان سے تو اقرار کرے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرے۔ اس قوم کی حالت جس قدر زبوں ہوسکتی ہے ظاہر ہے ایسے لوگوں کو جو خدا کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کریں کبھی راہنمائی نہیں مل سکتی'' مفہوم (۶۲/۵)۔

آگے چل کر فرمایا کہ ''یہودیوں کی ایسی حالت کیوں ہوگئی۔ اس لئے کہ انہوں نے دین خداوندی کو مذہب میں تبدیل کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اجتماعیت ختم ہو گئی۔ اور دین نام رہ گیا خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا۔ یہاں جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا کہ ''اے جماعت مومنین تم کہیں ایسا نہ کرنا۔ اپنی جماعتی زندگی کو زندہ و پائندہ رکھنا کہ یہی دین کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے مثلاً جب تمہیں ملی اجتماع الصلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جایا کرو تا کہ تم اپنے کانوں سے سن لو کہ وہ قوانین و ہدایات خداوندی کیا ہیں جن کے لئے تمہیں بلایا گیا ہے اور جن کے مطابق تمہیں کام کرنا ہے۔ اگر تم ذرا بھی علم و بصیرت سے کام لو گے تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آ جائے گی کہ یہ اجتماعات تمہارے لئے کتنے منفعت بخش ہیں'' مفہوم (۶۲/۹)۔

''جب یہ اجتماع صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر جہاں جی چاہے جاؤ اور تلاش معاش میں لگ جاؤ۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ قوانین خداوندی کا دائرہ صرف اس اجتماع تک محدود تھا۔ یہ قوانین تمہیں بتائے اور سنائے ہی اس لئے گئے تھے کہ تم اپنی عملی زندگی کے ہر گوشے میں ان پر کاربند رہو۔ لہٰذا اب جو تم کاروبار کے لئے نکلے ہو تو ان قوانین کو ہر وقت پیش نظر رکھو۔ اسی میں تمہاری کامیابی کا راز مضمر ہے۔ (دوسرے لوگ اپنی کامیابی کے لئے جو طریق چاہیں اختیار کریں۔ لیکن تم اپنی کامیابی کے لئے ہمیشہ قوانین خداوندی کا اتباع کرو۔ یہی کامیابی حقیقی کامیابی کہلا سکتی ہے)'' مفہوم (۶۲/۱۰)۔